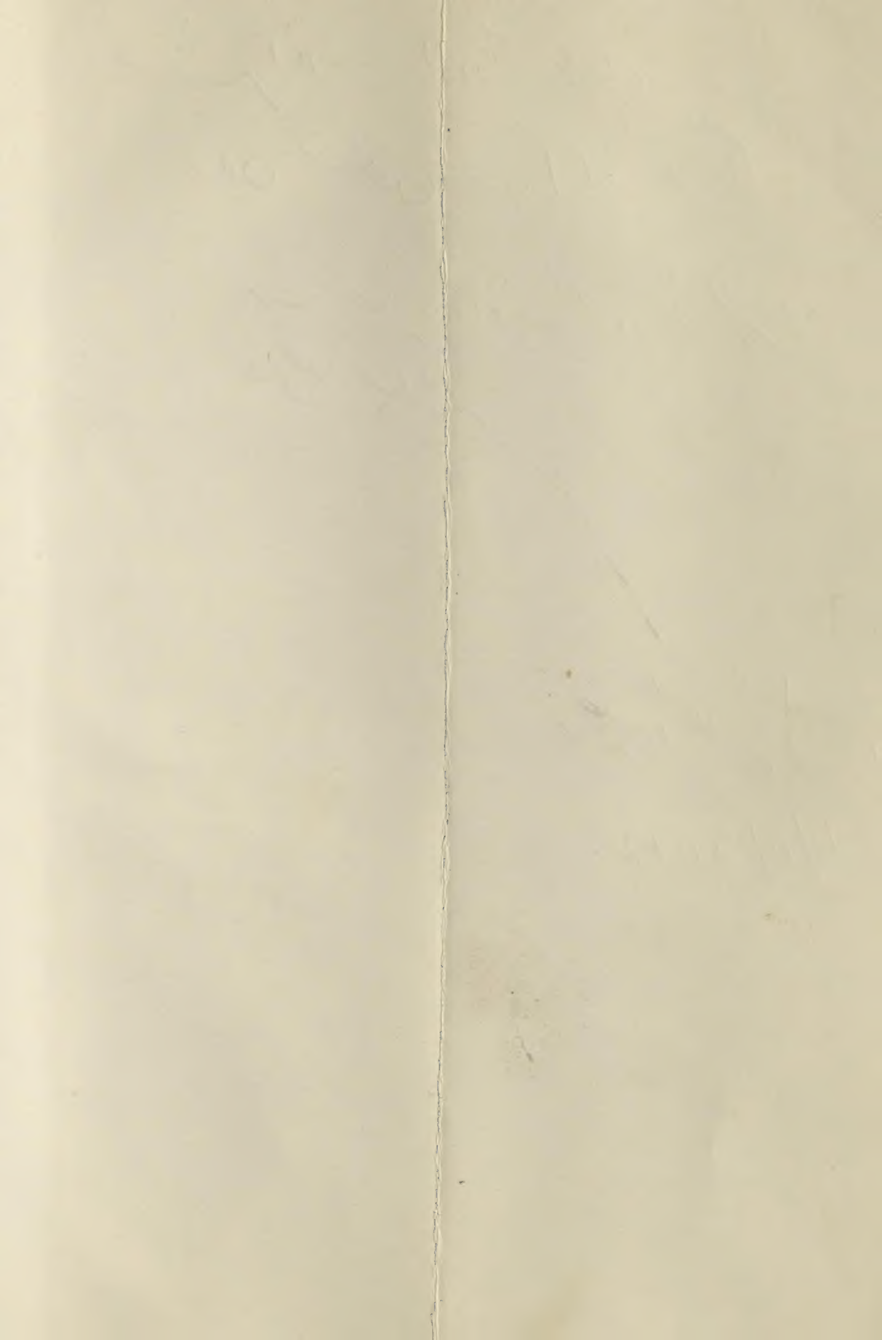

خوشبو
گلاب
کانٹے
ڈاکٹر رضیہ اسماعیل




بسم الله الرحمن الرحيم



خوشبو۔ گلاب۔ کانٹے

غزلیں • نظمیں • ماہیے • دوہے

ڈاکٹر رضیہ اسماعیل

BOOK HOME

خوشبو۔ گلاب۔ کانٹے

ڈاکٹر رضیہ اسماعیل

اہتمام	رانا عبدالرحمٰن
پروڈکشن	ایم سرور
کمپوزنگ	محمد انور، خواجہ محمد عارف
پرنٹرز	حاجی حنیف پرنٹرز، لاہور
اشاعت	مارچ 2012ء
قیمت	1000 روپے - 12 پاؤنڈ - 18 ڈالر
ناشر	بک ہوم لاہور



بک سٹریٹ 46- مزنگ روڈ لاہور، پاکستان
فون: 042-37231518-37245072 فیکس: 042-37310854
bookhome1@hotmail.com - bookhome_1@yahoo.com
www.bookhomepublishers.com

انتسابِ اوّل

ربِ جلیل کے نام
جس نے انسان کو بہترین صورت میں تخلیق کر کے قلم اور تخیل کی
نعمت سے نوازا

انتسابِ دوم

میرے خوابوں کی امین
بیٹیوں ثناء عائشہ اور ڈاکٹر وردہ کے نام

خصوصی انتساب

میرے تمام قلم کار دوستوں کے نام
جن کے خلوص اور حوصلہ افزائی نے میرے قلم کو توانائی اور تخیل کو
پرواز کے لئے نئے افق عطا کیے۔

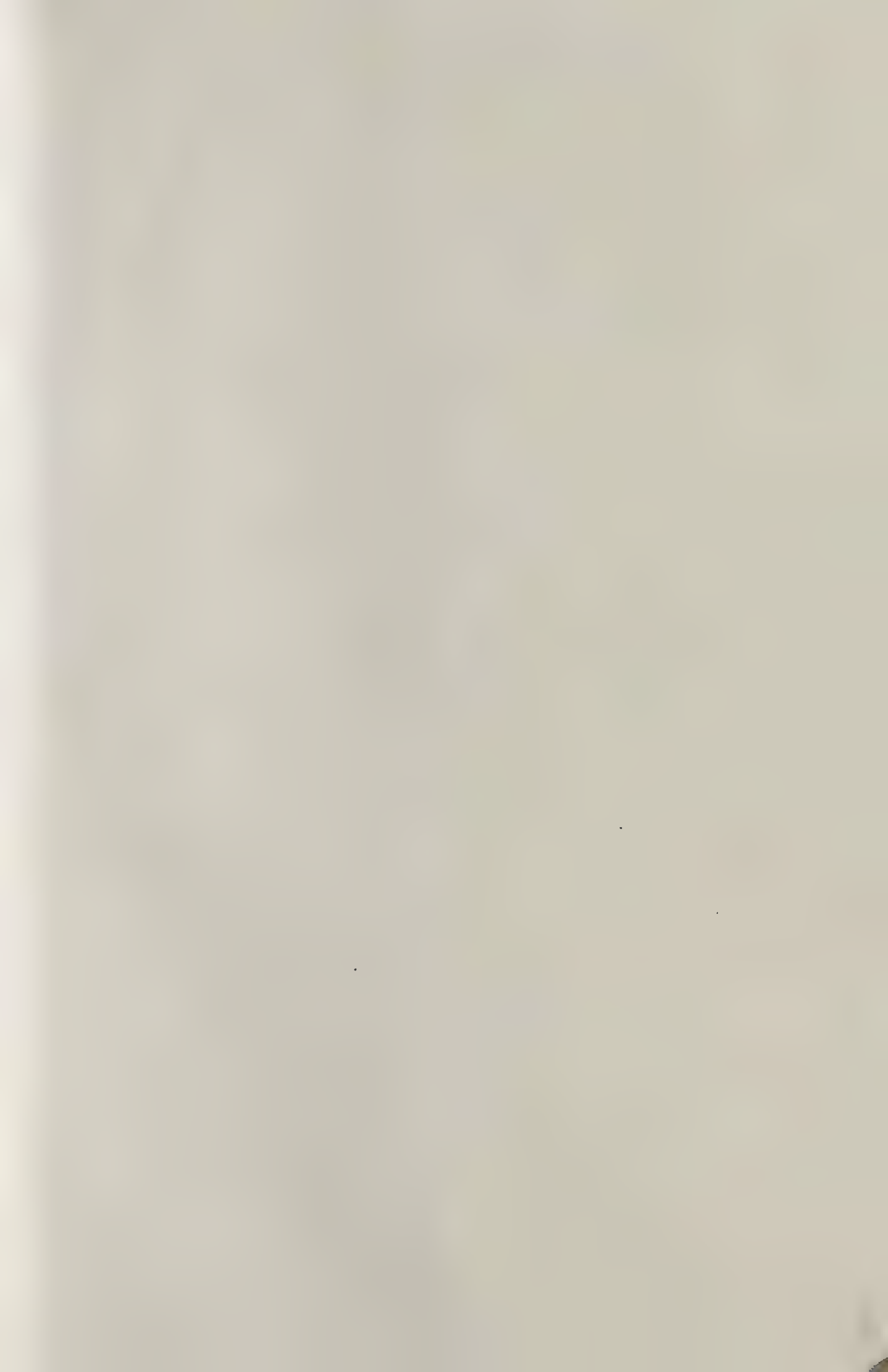
۱- گلابوں کو تم اپنے پاس رکھو
۲- سب آنکھیں میری آنکھیں ہیں
۳- میں عورت ہوں
۴- پیپل کی چھاؤں میں
۵- ہوا کے سنگ سنگ

گزشتہ چاروں شعری مجموعے (قدرے ترمیم و اضافہ کے ساتھ) پانچویں شعری مجموعہ "ہوا کے سنگ سنگ" کی اشاعت میں شامل کر دیئے گئے ہیں اور ان پانچوں مجموعوں کو "خوشبو • گلاب • کانٹے" کے نام سے پیش کیا جا رہا ہے۔

کوئی حدیں ہی نہیں ہیں تری حکومت کی
جدھر نگاہ اٹھاؤں، تری حضوری ہے

آقاؐ تیری کنیز ہو جاؤں
تیری گلیوں میں آ کے کھو جاؤں
من کی آنکھوں سے دیکھتی ہوں تجھے
کاش میں آنکھ آنکھ ہو جاؤں

فہرست



حرفِ آگہی

''خوشبو• گلاب• کانٹے'' میری اب تک کی تخلیقی کاوش کی ایک اہم کڑی ہے۔ اس میں گزشتہ چاروں شعری مجموعے (قدرے ترمیم واضافہ کے ساتھ) نئے اور پانچویں شعری مجموعے ''ہوا کے سنگ سنگ'' کے ساتھ یک جا کر دیئے گئے ہیں۔اس نئی ترتیب کی بڑی وجہ تو یہی ہے کہ گزشتہ چاروں شعری مجموعے آج سے تقریباً بارہ برس قبل شائع ہوئے تھے۔ان کی اب چند جلدیں ہی باقی رہ گئی ہیں۔''ہوا کے سنگ سنگ'' کی اشاعت کا ارادہ کیا تو خیال آیا کہ کیوں نہ گزشتہ شعری مجموعوں کو بھی اس اشاعت میں ہی شامل کر دیا جائے تا کہ ان سب کی الگ الگ اشاعت کی زحمت سے بچا جا سکے۔اس طرح پانچوں شعری مجموعے ایک نئے عنوان یعنی ''خوشبو• گلاب• کانٹے'' کے نام سے زیورِ طباعت سے آراستہ ہوئے ہیں۔

ذرا مزید وضاحت کہ ''گلابوں کو تم اپنے پاس رکھو'' میرا پہلا شعری مجموعہ تھا جو کہ ۲۰۰۰ء میں منصۂ شہود پر آیا۔اس میں غزلیں اور نظمیں (پابند، آزاد اور نثری) شامل تھیں۔ جب کہ نیا شعری مجموعہ ''ہوا کے سنگ سنگ'' غزلوں، نظموں (پابند، آزاد اور نثری) اور دوہوں پر مشتمل ہے۔

ان دونوں شعری مجموعوں کی غزلیات، قطعات، متفرق اشعار اور فردیات کو حصہ غزلیات میں اکٹھا کر دیا گیا ہے۔''سب آنکھیں میری آنکھیں ہیں''، ''گلابوں کو تم اپنے

پاس رکھو' اور ''ہوا کے سنگ سنگ'' کی تمام نظموں (آزاد و پابند) کو حصہ منظومات میں یک جا کر دیا گیا ہے تا کہ قاری پر تحریر کا ایک مجموعی تاثر برقرار رہ سکے۔

''میں عورت ہوں'' نثری نظموں کی کتاب انگریزی ترجمے کے ساتھ شائع ہوئی تھی لیکن بوجوہ انگریزی ترجمہ اس مجموعے میں شامل نہیں کیا جا رہا۔ مگر چاروں مجموعہ ہائے کلام کی تمام نثری نظموں کو اب یک جا کر دیا گیا ہے۔

اس طرح سے ''خوشبو • گلاب • کانٹے'' غزلوں، نظموں، نثری نظموں، ماہیوں اور دوہوں کا مجموعہ ہے۔

نئے شعری مجموعہ ''ہوا کے سنگ سنگ'' میں غزلیں، قطعات، آزاد اور نثری نظمیں اور دوہے شامل ہیں۔ جن میں چالیس غزلوں اور متعدد قطعات کے ساتھ ساتھ بہت سے متفرق اشعار اور فردیات بھی شامل ہیں۔

۹ آزاد نظمیں ہیں جن میں ''آغازِ نو''، ''پرنس ڈایانا کی موت''، ''بیٹی''، ''آواز''، ''ہوا کے سنگ سنگ''، ''ہمیں اب تیز چلنا ہے''، ''تیرا نام بھی پیارا ہے'' اور میرا جی کے لئے ایک نظم ''سوچ سمندر'' شامل ہیں۔

چھ نثری نظموں میں ''بارُود''، ''نیلی رگیں''، ''ریشمی ڈوری''، ''نوزائیدہ خواب''، ''تم میرا حصہ بھی لے لو'' اور ''پورا خواب'' شامل ہیں۔ جب کہ دوہے الگ حصے میں ترتیب دیئے گئے ہیں۔

''پیپل کی چھاؤں میں'' شامل تین سو ماہیے بالکل وہی ہیں جو شروع میں شائع ہوئے تھے، ان میں قطعاً کوئی ترمیم و اضافہ نہیں کیا گیا۔

آخر میں ایک حصہ ''اہلِ نظر کے تاثرات'' کے عنوان سے ہے جس میں تمام دوست احباب کے تبصرے، جائزے اور اظہارِ خیال شامل ہیں۔ ان میں عدیم ہاشمی، بشریٰ رحمٰن، حیدر قریشی، شہناز مزمل، زاہد مسعود، شبنم شکیل، فرحت عباس شاہ، ڈاکٹر حسن رضوی، محمود

ہاشمی، ڈاکٹر صفات علوی، شاہدہ احمد، یعقوب نظامی، پاکیزہ بیگ، پروین شیر، عفیہ صدیقی، طلعت سلیم، عثمان صدیقی، قاضی عنایت الرحمٰن، طارق شاہد، سلطان محمود، ڈاکٹر علی اکبر منصور، شاہد بخاری، فرخ زہرا گیلانی، سلطانہ مہر، عصمت بانو، ایک مداح کا کھلا خط اور اقبال راہی کا ہدیۂ سپاس شامل ہیں۔

میں تمام قلم کار دوستوں کی تہِ دل سے شکرگزار ہوں کہ انھوں نے اپنے قیمتی وقت میں سے چند لمحے میری نذر کیے۔ میری تخلیقی کاوشوں کا سراہا اور میری حوصلہ افزائی کی۔

اسماعیل اعظم، میرے شریکِ سفر، ہمیشہ میرے کلام کے پہلے سامع رہے۔ وہ خود بھی اُردو ادب کے ایک باذوق قاری، سخن شناس اور ایک ناقدانہ نگاہ رکھتے ہیں۔ انھوں نے نہایت غیر جانب داری سے مجھے فکر انگیز مشوروں سے نوازا۔

یہ میری خاندانی تربیت کا حصہ ہے کہ میں نے زندگی میں جس کسی سے بھی اکتسابِ علم کیا ہے، اس کا ہمیشہ کھلے دل سے احترام اور اعتراف کیا ہے۔ وگرنہ کچھ لوگ تو اساتذہ کا ذکر کرنے میں بھی کم ظرفی کا مظاہرہ کرتے ہیں۔ اور تاثر یہ دیا جاتا ہے کہ جیسے انھوں نے پالنے میں ہی شعر کہنے اور مشاعرے پڑھنے شروع کر دیئے تھے۔

۱۹۹۶/۹۷ء میں اقبال اکیڈمی کے صدر اور انجمن ترقی اُردو (برمنگھم) کے سربراہ ڈاکٹر سعید اختر درّانی نے علمِ عروض کے بارے میں کچھ مفید مشوروں سے نوازا۔ خصوصی شکریہ عدیم ہاشمی کے لئے، جن سے ملاقات ۱۹۹۸ء میں برطانیہ میں ہوئی۔

زمانۂ طالب علمی سے ہی میں ان کی شاعری کی بہت مدّاح تھی۔ ان کی غزل...... ''کٹ ہی گئی جدائی بھی، کب یہ ہوا کہ مر گئے''......۱۹۷۱ء سے میری بیاض میں درج تھی۔ لیکن ان سے ملاقات تقریباً تیس سال بعد ہوئی۔ عدیم نے میرے اندر کے تخلیق کار کو پہچانا۔ میرا یہ شعر سن کر کہ:

گلابوں کو تم اپنے پاس رکھو
مجھے کانٹوں پہ چلنا آ گیا ہے

بے حد داد دی بلکہ اسی وقت کئی دوستوں کو پاکستان اور افتخار نسیم کو شکاگو فون کر کے بتایا کہ دیکھئے کیا شعر ہے۔ کہنے لگے کہ ''اچھا شعر پر لگا کر اڑ جاتا ہے۔'' میری بے حد حوصلہ افزائی کرتے ہوئے نہایت قیمتی مشوروں سے نوازا اور مجھے میری تحریروں کی اشاعت پر بہت زور دے کر آمادہ کیا۔ بقول عدیم ''آپ کی تحریر دنیائے شعروادب کی امانت ہے اور آپ کو اس میں خیانت کرنے کا کوئی حق نہیں پہنچتا۔''

مجھے ہمیشہ اس بات پر فخر رہے گا کہ جدید اُردو غزل کے ایک نمائندہ شاعر نے میری تحریر کو سراہا۔ میری حوصلہ افزائی کی، جس نے مجھے مزید لکھنے کا حوصلہ عطا کیا و گرنہ شاید سب تخلیقی سرمایہ کہیں اندر ہی تلف ہو جاتا۔ میں یہ بات کہے بغیر نہیں رہ سکتی کہ دنیائے شعرو ادب میں ذاتی سطح پر عدیم کی جو بھی شکر رنجیاں تھیں، مجھے محسوس ہوتا ہے کہ کسی نہ کسی طور پر ان کی آنچ مجھ تک بھی پہنچی ۔ پاکستان اور خصوصاً برطانیہ میں کچھ مخصوص افراد منفی پروپیگنڈے میں مصروف رہے۔ حالانکہ میری ان سے ذاتی سطح پر کوئی مخاصمت نہیں تھی۔ خود کو بظاہر قلم کار اور دانشور کہلانے والوں نے اپنے گفتار و کردار سے خود کو ہی پست ثابت کیا۔ مگر عدیم ہاشمی کے اس شعر نے مجھے ہمیشہ آگے بڑھنے کا حوصلہ دیا۔

رک جاؤ عدیمؔ اپنا سخن سنگ بنا لو
بھاگو گے تو بڑھ جائے گی آوازِ سگاں اور

میں نے بھی ''آوازِ سگاں'' پر کوئی توجہ نہیں دی۔ کسی کو پلٹ کر جواب نہیں دیا بلکہ خاموشی سے اپنا تخلیقی سفر جاری رکھا۔

میری ہر تخلیقی کاوش دوسری سے الگ ہے۔ میں نے اگر غزل میں طبع آزمائی کی ہے تو نظم بھی لکھی ہے۔ میرے ہاں اگر ماہیے کی تانیں ہیں تو دوہوں کی چاشنی بھی موجود ہے۔ میں نے صرف شاعری پر اکتفا نہیں کیا بلکہ نثر میں اگر انشائیہ لکھا ہے تو طنز و مزاح بھی لکھا۔ کہانی لکھی تو افسانہ بھی لکھ رہی ہوں اور سفر نامہ بھی زیرِ تصنیف ہے۔ اور یہی کسی کے

ایک ''اوریجنل اور جینوئن'' قلمکار ہونے کا ثبوت ہے کہ اس کے تخلیقی عمل میں تنوع (Diversity) موجود ہو۔

رب العزت کی شکر گزار ہوں کہ اس نے مجھے پوری فکری سچائی کے ساتھ اپنے تجربات، مشاہدات اور محسوسات کو صفحہ قرطاس پر منتقل کرنے کی مہلت عطا کی۔ میں سمجھتی ہوں کہ قلم کے سینے میں وقت کی امانتیں دفن ہوتی ہیں اور ایک سچے قلم کار کا فرض ہے کہ وہ ان امانتوں کو پوری دیانت داری سے قلم کے سپرد کردے۔ مجھے اس بات پر یک گونہ اطمینان ہے کہ میں نے حوصلہ شکن رویوں کے باوجود اپنے چالیس سالہ تخلیقی سرمائے کو ضائع نہیں ہونے دیا۔ ترسیل کے معاملے میں البتہ میں ہمیشہ تساہل کا شکار رہی ہوں۔ شاید اس کی بڑہ وجہ یہ رہی ہو کہ میری تحریروں میں کہیں میرا اپنا ہی کتھارسس ہو رہا تھا اور میں اپنے ہی لئے لکھ رہی تھی۔ (شاید ہر قلم کار کے ساتھ ایسا ہی معاملہ رہا ہو۔) اس لئے ابلاغ کی طرف زیادہ توجہ نہیں دے پائی۔ البتہ کچھ عرصے سے دوستوں کے اصرار پر اپنی شعری اور نثری تحریریں کچھ رسائل و جرائد کو بھیجنی شروع کر دی ہیں۔

اب بات چل نکلی ہے تو اتنا ضرور کہوں گی کہ اس تخلیقی سفر کے دوران میں نے اس بات کو شدت سے محسوس کیا کہ عورتوں کی تخلیقی صلاحیتوں کو تسلیم کرنے میں ہمیشہ پس وپیش سے کام لیا جاتا ہے (یقیناً دیگر قلم کار خواتین بھی اس تجربے سے گزری ہوں گی) گویا عورت ذہن اور احساس سے عاری صرف ایک جسم ہے جس کا مقصدِ حیات نسلِ انسانی کی بڑھوتی، مردوں کی فرمانبرداری اور چولھا چوکا کرنے کے سوا اور کچھ نہیں۔ اگر وہ قلم سنبھالتی بھی ہے تو اس کی فکری اور ذہنی صلاحیتوں کو دوسرے درجے، کم معیار اور گھٹیا تسلیم کر کے اس کی نفی کی جاتی ہے۔ یا پھر وہ کئی طرح کی الزام تراشیوں کی زد میں آجاتی ہے۔

شاید اسی لئے ..... '' صدیوں تک عورت کے فن پارے منہ بند تجوریوں کی طرح زبان بندی کے قفل میں رکھے رہے۔ وہ اندر ہی

اندر شعر تراشتی، کہانیاں لکھتی، تصویریں بناتی رہی مگر آنچل میں بندھی
گرہ کھولنے کی اجازت نہ ملنے کے انتظار میں نہ جانے کیا کچھ اس
کے اندر ہی تلف ہو گیا۔ اور اجازت اس لئے نہ مل سکی کہ اس کے اندر
چھپے خزانے نظروں میں آ کر اس کی فکر کو اعتبار نہ دے دیں۔''......

(شاہدہ احمد، لندن، ۱۹۹۹ء)

میرے خیال میں عورت کی طرف صدیوں پرانے رویوں میں آج بھی کوئی خاص تبدیلی نہیں آئی ہے۔ آخر عورتوں کی تحریروں کو صدقِ دل سے سمجھنے، ان کے تخلیقی جوہر کو سراہنے کے لئے ہم کب اپنے ذہنوں کو روایت اور تعصب کے سانچوں سے باہر نکالیں گے؟ ہم کب بالغ نظری سے سوچیں گے کہ عورت کی داخلی دنیا (باطنی نفس Inner world) میں کیا تلاطم برپا ہیں۔

عورت کیا ہے؟ کیوں ہے؟ کون ہے؟ اس کے خواب، اس کی آرزوئیں، اس کے آدرش، پر کھولنے کی کواہش، اُڑان بھرنے کی آرزو، زندگی کو زندگی کرنے کی چاہ، محبتیں اسے کیسے سیراب کرتی ہیں، کیسے سرشار رکھتی ہیں اور بے عزتیاں اسے کیسے آزردہ، پامال اور رسوا کرتی ہیں۔ دکھوں کی صلیب کندھوں پر اٹھا کر چلنے کی کوشش میں رگِ جاں پر کیسے کیسے زخم آتے ہیں۔ اسے زندگی میں کس طرح چومکھی لڑائی لڑنی پڑتی ہے۔ اس کے سب ہی محاذ زندہ ہیں جہاں اس پر چاروں طرف سے جسمانی، جذباتی، ذہنی، نفسیاتی، مالی اور اخلاقی حملے ہو رہے ہیں۔ اور وہ اپنے بچاؤ کی کوشش میں ہلکان ہو رہی ہے۔ آخر ہم میں وہ جذباتی خواندگی (Emotional literacy) کب پیدا ہوگی کہ ہم ایک عورت کو ماں، بہن، بیٹی اور بیوی کے خانوں کے علاوہ بھی صرف ایک عورت ہونے کے ناتے سے اس کی داخلی کیفیات وجذبات کو سمجھیں گے۔

کسی نے کیا خوب کہا ہے کہ......''جس معاشرے میں عورت کی تخلیقی گواہی کو رد کر

نے کی روایت پڑ جائے ، وہ معاشرہ بانجھ ہو جاتا ہے۔'' اور بانجھ عورت کا دُکھ ایک عورت کے سوا اور کون جان سکتا ہے اور وہ بھی ایک تخلیق کار!

بات سے بات یاد آ گئی کہ میرے ایک شعر پر کسی نے بڑا مضحکہ خیز (کم از کم میں تو یہی سمجھتی ہوں) اعتراض کیا ہے۔ شعر یہ ہے:

وقت کی گود میں اک سویا ہوا لمحہ ہوں

جاگ اٹھوں تو بڑا حشر بپا ہوتا ہے

بقول ان صاحب کے، لمحہ تو مذکر ہے اور عورت مؤنث ہونے کے ناتے کیسے خود کو لمحے سے تشبیہ دے سکتی ہے۔ وگرنہ یہ لگے گا کہ یہ شعر کسی مرد کا لکھا ہوا ہے۔ اگر پڑھے لکھے اور خود کو قلم کار کہلانے والوں کی یہ سوچ ہے تو سمجھ میں نہیں آتا کہ بات کہاں سے شروع کروں۔ اس قسم کے اعتراضات کرنے والوں سے میں اتنا پوچھنا چاہتی ہوں کہ انھوں نے عورتوں کے لئے کون سی الگ ''فرہنگِ آصفیہ'' مرتب کر دی ہے کہ ایسے اعتراضات اٹھائے جا رہے ہیں۔ کیا عورتیں ٹائم زون سے باہر ہیں؟ کیا وہ زمان و مکان سے آزاد ہیں کہ خود کو وقت سے تشبیہ نہیں دے سکتیں؟ کیا وقت پر صرف مردوں کی اجارہ داری ہے؟ میرے نزدیک تو خدا، زمانہ، وقت سب ہی بے جنس یا جنڈر لیس (gender less) ہیں۔ اور خود رب العزت نے اپنے آپ کو ستر ماؤں سے تشبیہ دی ہے۔ اس پر بھی اعتراض اٹھائیں!!!

ایسی لغت جو عورت کے جذبات و احساسات کی ہر رنگ میں ترجمانی کرے، جہاں وہ کبھی عاشق تو کبھی معشوق، کبھی عورت اور کبھی مرد بن کر سوچے، وہ زبان ہم نے ابھی تک ایجاد نہیں کی۔

ادب کو اس طرح سے تذکیر و تانیث کے خانوں میں بانٹنا، دراصل عورت کے تخلیقی عمل کو گالی دینے کے برابر ہے اور بجائے خود ادب کی توہین ہے۔

اُردو نسائی شاعری کی پہچان خوشبو کی شاعرہ، پروین شاکر کا زبان زدِ عام شعر

وہ تو خوشبو ہے، ہواؤں میں بکھر جائے گا

مسئلہ پھول کا ہے، پھول کدھر جائے گا

میرے خیال میں تو اس شعر پر بھی اعتراض اٹھایا جانا چاہیے۔ کیونکہ خوشبو مؤنث ہے، پھر مرد کو اس سے کیوں کر تشبیہ دی جا سکتی ہے۔ بادی النظر میں تو لغت کے اعتبار سے یہ تشبیہ بھی غلط ہے۔ کیونکہ اگر میں خود کو ''لمحے'' سے تشبیہ نہیں دے سکتی تو پروین شاکر کا محبوب ''خوشبو'' کیسے ہو سکتا ہے؟

اس سلسلے میں میری کئی قلم کار دوستوں (بشمول حیدر قریشی) سے گفتگو ہوئی تو انھوں نے یہی کہا کہ ''لمحے یا خوشبو'' دونوں پر اعتراض کرنے والی کوئی بات نہیں۔ کیونکہ جمالیاتی لحاظ سے دونوں ہی درست ہیں اور شاعری میں اس کی اجازت ہے۔

بات ذرا آگے بڑھاتی ہوں...... میں اکثر و بیشتر برطانیہ میں انگلش لٹریری سرکلز میں جاتی رہتی ہوں۔ پچھلے دنوں ایک سیاہ فام شاعرہ...... جین بنٹا بریز (Jean Binta Breeze) کی شاعری کی کتاب "Third World Girl" یعنی تیسری دنیا کی لڑکی کی رسمِ اجرا کی تقریب میں جانے کا موقعہ ملا۔ اس کی ایک خوب صورت نظم کا ابتدائی بند ملاحظہ ہو۔

I am a Third World girl

Uncut diamond

Unfound pearl

Wakened from my dreaming

Far too early for my years

Filled with stories

Yet untold......

Young, unknowing, born too old.

اس بند کا ترجمہ میں نے کچھ یوں کیا ہے کہ:

''میں تیسری دنیا کی لڑکی

اک ناتراشیدہ ہیرا

نادریافت موتی

میرے عہد سے بہت پہلے

میرے خواب سے

مجھے جگا دیا گیا

اَن گنت......اَن کہی کہانیاں

میرے اندر مچل رہی ہیں

میں جوان......نادان......ناجہاندیدہ

مگر......پیدائش سے پہلے ہی عمر رسیدہ!

یہاں شاعرہ نے خود کو ہیرے اور موتی سے تشبیہ دی ہے۔ مگر یہاں تو کسی نے تذکیرو تانیث کا مسئلہ نہیں اٹھایا۔ اگر دیکھا جائے تو پنجابی صوفیانہ شاعری میں بھی صوفیائے کرام نے اکثر وبیشتر صیغہ تانیث میں ہی بات کی ہے۔ مثلاً

کنجری بنیاں میری عزت نہ گھٹدی

مینوں نچ کے یار مناون دے

گلابوں کو ٹھکرا کر کانٹوں پر چلنے اور پھر ہوا کے سنگ سنگ اُڑنے تک کے تخلیقی سفر کے درد کو اگر کسی نے صحیح معنوں میں پہچانا ہے تو وہ ایک عورت ہے جو خود بھی ایک اعلیٰ پائے کی تخلیق کار ہے......بشریٰ رحمٰن......جس نے میری تحریروں کو پڑھ کر جو بات کہی اسے سن کر میری آنکھیں نم ہو گئیں۔ بشریٰ کہتی ہیں کہ:

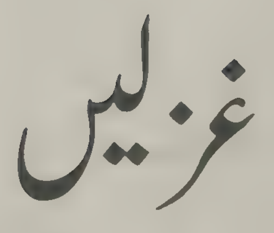
''رضیہ اسماعیل کی تحریروں میں اداسی یوں چھائی رہتی ہے جیسے کعبے کی
فضاؤں میں دعائیں رہتی ہیں۔''

میں سمجھتی ہوں کہ میری تحریر کے لئے اس سے بڑا اور کوئی کمپلیمنٹ (Compliment) یعنی توصیفی بلکہ تاریخی جملہ ہو ہی نہیں سکتا۔ کیونکہ یہی دکھ، یہی غم، یہی اداسی، یہی نارسائی میری تحریر کی روح ہے۔ بقول شاعر

چلی سمتِ غیب سے اک ہوا کہ چمن سرور کا جل گیا
مگر ایک شاخِ نہالِ غم جسے دل کہیں وہ ہری رہی
(سراج الدین سراجؔ)

میں اسی نہالِ غم کی چھاؤں میں، پاؤں پاؤں چلتی، صحرا نوردی کرتی، کڑوے کسیلے پانیوں کو اسمِ اعظم پڑھتے، زمزم میں بدلتی ادب کے نخلستان میں جا پہنچی۔ اس تلاش و جستجو پر اپنے مالک کی شکر گزار ہوں کہ جس نے انسان کو بہترین صورت میں تخلیق کر کے قلم اور تخیل کی نعمت سے نوازا۔

ڈاکٹر رضیہ اسماعیل
بتاریخ ۱۹ر جنوری ۲۰۱۲ء
برمنگھم، برطانیہ
aaghee@hotmail.com


غزلیں

گلابوں کو تم اپنے پاس رکھو
مجھے کانٹوں پہ چلنا آ گیا ہے

حسنِ ترتیب

○

اے کاش سرِ صحرا اک پھول کھلا ہوتا
اس پھول کے پہلو میں اک دیپ جلا ہوتا

کچھ غم تو اندھیرے کا جھونکوں پہ کھلا ہوتا
اے کاش ہواؤں کے ہاتھوں میں دیا ہوتا

راتوں کا اندھیرا ہے، تنہائی ہے اور میں ہوں
ایسے میں کوئی جگنو پہلو سے لگا ہوتا

گھر ڈھونڈنے نکلے تھے، ویرانے میں آ پہنچے
اے کاش کہ رستوں میں ترا نام لکھا ہوتا

ہے جال اندھیروں کا، جاؤں تو کدھر جاؤں
رستے میں ترے گھر کے اک دیپ جلا ہوتا

تو اور کہیں پر ہے، میں اور کہیں پر ہوں
میں تجھ کو ملی ہوتی، تو مجھ کو ملا ہوتا

○

دیواروں پر نقش بناتی رہتی ہوں
خود کو لکھتی اور مٹاتی رہتی ہوں

پلکوں پر خوابوں کی تہیں جم جاتی ہیں
پلکوں سے پھر گرد اُڑاتی رہتی ہوں

یادیں جب بھی باہیں کھول کے آتی ہیں
یادوں سے میں ہاتھ چھڑاتی رہتی ہوں

روز کا رونا آنکھ کہاں تک دیکھے گی
اشکوں سے اب آنکھ چراتی رہتی ہوں

کہنے کی سو باتیں ہیں پر کیسے کہوں
سوچتی ہوں اور ہونٹ چباتی رہتی ہوں

بند گلی میں رستے ڈھونڈتی رہتی ہوں
رستوں کا پھر سوگ مناتی رہتی ہوں

○

مت قید کرو خوشبو کو تم
یہ قید نہیں کر پاؤ گے

قیدی جو بنایا اس نے تمھیں
فریاد نہیں کر پاؤ گے

○

کہاں گرفت میں اب ماہ و سال کے موسم
بکھرتے جاتے ہیں تیرے وصال کے موسم

ترے جواب کے وقفے طویل کتنے ہیں
گزرتے جاتے ہیں میرے سوال کے موسم

ہر ایک پھول کلی کو بلا رہا ہے قریب
چمن میں آئے ہیں اب کے کمال کے موسم

میں ڈوبتی ہوں کناروں پہ اور کہتی ہوں
کبھی نہ دیکھے تھے ایسے زوال کے موسم

تو اپنی آنکھ میں تابِ بہار لا تو سہی
جہان بھر میں ہیں حسن و جمال کے موسم

کہ جیسے ذہن میں عہدِ خزاں اتر آیا
بہت ہی زرد ہوئے ہیں خیال کے موسم

○

میں خار خار الجھتی رہی تمھارے لئے
میں پھول پھول مہکتی رہی تمھارے لئے

وصال رُت میں گلابوں کا ہاتھ تھامے ہوئے
میں چہرہ چہرہ دمکتی رہی تمھارے لئے

مِری تلاش کے پاؤں میں پڑ گئے چھالے
میں قریہ قریہ بھٹکتی رہی تمھارے لئے

لبوں پہ لے کے محبت کے پُر فسوں نغمے
میں ڈال ڈال چہکتی رہی تمھارے لئے

مِرے وجود میں تنہائیوں کا صحرا تھا
میں پور پور سسکتی رہی تمھارے لئے

خزاں بہار کے چہرے پہ خاک ڈال گئی
میں پتی پتی بکھرتی رہی تمھارے لئے

○

مل جاتے ہیں غم لیکن غم خوار نہیں ملتے
بکتی ہوں جہاں خوشیاں، بازار نہیں ملتے
غم گھر کی منڈیروں پر آرام سے بیٹھا ہے
جانے کے ابھی اس کے آثار نہیں ملتے

○

غموں پہ ہاتھ ملنا آ گیا ہے
کھلونوں سے بہلنا آ گیا ہے

بہت پتھر کیا تھا خود کو میں نے
تو بچھڑا تو پگھلنا آ گیا ہے

محبت ہے کہ تو نفرت ہے، جو ہے
ترے سانچے میں ڈھلنا آ گیا ہے

یہ کیسی درد کی سوغات دی ہے
بنا شعلوں کے جلنا آ گیا ہے

تجھے یہ سُن کے دُکھ ہو یا خوشی ہو
مجھے گر کر سنبھلنا آ گیا ہے

گلابوں کو تم اپنے پاس رکھو
مجھے کانٹوں پہ چلنا آ گیا ہے

○

لفظوں کی جھنکار کو مرنے مت دینا
اندر کے فن کار کو مرنے مت دینا

کوثر اور تسنیم سے دھو لو ہونٹوں کو
ناطق ہو، گفتار کو مرنے مت دینا

پتی پتی چُن کر پھول بنا لینا
خوشبو کے سنسار کو مرنے مت دینا

منزل دُور بہت اور پاؤں زخمی ہیں
چلتے رہو، رفتار کو مرنے مت دینا

سجدوں اور دعاؤں کی سوغاتوں سے
تم اپنے بیمار کو مرنے مت دینا

مرنا پڑے سو بار اگر تو مر جاؤ
پر اپنے کردار کو مرنے مت دینا

○

اگر میں آنکھ ہوں تو دیکھنے سے کون روکے گا
اگر میں لفظ ہوں تو بولنے پر کون ٹوکے گا
مِرے افکار کی طاقت زمانے کو ڈرا دے گی
میں سچ ہوں جھوٹ کے باٹوں سے مجھ کو کون تولے گا

○

تیری یادوں کا جو اک دیپ جلا ہوتا ہے
شاخ پہ جیسے کوئی پھول کھلا ہوتا ہے

وقت کی گود میں اک سویا ہوا لمحہ ہوں
جاگ اٹھوں تو بڑا حشر بپا ہوتا ہے

دل کی حالت ہے کسی ہجر کے موسم جیسی
ایسے موسم میں بھی تو جلوہ نما ہوتا ہے

راستے میری مسافت سے تھکے جاتے ہیں
میں نہیں راستہ اب آبلہ پا ہوتا ہے

تجھے پا کر بھی یہ دل ڈھونڈتا رہتا ہے تجھے
تو مِرے پاس بھی یوں کھویا ہوا ہوتا ہے

روح یوں پھاند گئی جسم کی دیواروں کو
جیسے پنچھی کوئی پنجرے سے رہا ہوتا ہے

○

محبتوں کا خیال رکھنا
نہ دل میں کوئی ملال رکھنا
بس اتنا کہنا ہے تم سے جاناں
تم اپنی آنکھیں سنبھال رکھنا

O

ٹوٹا ہوا خوابوں کا نگر دیکھ رہی ہوں
اب دید کی خواہش نہیں، پر دیکھ رہی ہوں

چھپتی نہیں آنکھوں کی نمی لاکھ چھپائیں
ہر چہرے پہ میں دیدۂ تر دیکھ رہی ہوں

پنچھی ہے، قفس ہے، کہیں پرواز کی خواہش
میں پنجرے میں ٹوٹے ہوئے پر دیکھ رہی ہوں

اینٹوں سے مکاں بنتے ہیں، گھر پیار وفا سے
بازار میں بِکتے ہوئے گھر دیکھ رہی ہوں

نالے مِرے جا پہنچے ہیں اب عرشِ بریں تک
میں اپنی دعاؤں کا اثر دیکھ رہی ہوں

○

آنکھ خوابوں کو تخلیق کرتی رہی
زندگی قطرہ قطرہ ٹپکتی رہی
روشنی، چاندنی، خوشبوئیں، تتلیاں
منہ چھپائے چھپائے سسکتی رہی

○

اک پتّا ٹوٹ کے آیا ہے
پیغام خزاں کا لایا ہے

ہم مفلس تھے، ہم مفلس ہیں
تری یاد ہی اِک سرمایہ ہے

ہر پل کو دیکھ کے ڈرتی ہوں
ہر وقت سے دھوکا کھایا ہے

ہر سپنا آنکھ سے بہہ نکلا
یہ کیسا آنسو آیا ہے

دیوار بنا کر تو دیکھو
ہر دھوپ میں پنہاں سایا ہے

پھر بھول گئے ہم آندھی کو
پھر آس کا دیپ جلایا ہے

○

خالی مکان رہ گیا اور گھر چلا گیا
دیوار چیختی ہے، مِرا در چلا گیا

قاتل سمجھ رہا تھا قدموں پہ گر پڑوں گی
پاؤں وہیں تھے، آگے مِرا سر چلا گیا

پتھر تراشنے کا ہنر جانتی نہ تھی
ہاتھوں میں دے کے تیشہ، ستم گر چلا گیا

اپنی نظر بھی مجھ کو فریبِ نظر لگی
میں سنگ دیکھتی رہی، مرمر چلا گیا

پاؤں سے جگنو باندھ کے نکلی سفر پہ جب
رستے سبھی چراغ تھے، رہبر چلا گیا

○

تم سمجھتے نہیں ہو چارہ گرو
حال کیسے سنائیں اندر کے

بادباں کی حفاظتوں میں کہیں
ہاتھ زخمی ہوئے سمندر کے

○

کس طرف آنکھ اٹھاؤں، میں کہاں تک دیکھوں
تو ہی آتا ہے نظر مجھ کو جہاں تک دیکھوں

دور تک بکھرے ہوئے پھول ہیں اور پتّے ہیں
میں بہاروں کا سماں عہدِ خزاں تک دیکھوں

تجھ کو شعلے بھی نظر آئے نہ میرے دل کے
میں تو کھلتے ہوئے پھولوں کا دھواں تک دیکھوں

کتنے پہلو ہیں ترے، کتنے ترے چہرے ہیں
تُو مجھے یہ تو بتا تجھ کو کہاں تک دیکھوں

جو نہ ممکن تھا وہ ممکن کی حدوں تک دکھا
میں ترا عکس تہِ آبِ رواں تک دیکھوں

تیرے دیدار کے آداب کی سوگند مجھے
تجھے دیکھوں بھی تو قدموں کے نشاں تک دیکھوں

(احمد ندیم قاسمی کی زمین میں)

○

عجیب درد کا رشتہ ہے جسم و جاں کے ساتھ
کہ جیسے در کو ہو نسبت کسی مکاں کے ساتھ
میں ٹوٹ ٹوٹ کے بکھری تو یہ ندا آئی
گلوں کا ایسا ہی رشتہ ہے گلستاں کے ساتھ

ز

O

دو چار قدم چل کر رستہ ہی دکھا دیتے
منزل نہ سہی لیکن منزل کا پتا دیتے

امّید کے ساحل پر اب آگ برستی ہے
گر جلنا مقدر تھا پہلے ہی بتا دیتے

سب نیند ہوئی رخصت آنکھوں کے دریچوں سے
تم پاس اگر ہوتے پل بھر کو سلا دیتے

پتھرائی سی آنکھوں میں آنسو بھی نہیں آتے
احسان بہت کرتے مجھ کو جو رُلا دیتے

جلتی ہوں، نہ بجھتی ہوں، کیسی یہ قیامت ہے
یا مجھ کو بجھا دیتے یا مجھ کو جلا دیتے

O

میں درد کا اک شہر بسا لیتی تو اچھا تھا
جو زخم دیئے تو نے چھپا لیتی تو اچھا تھا
رِستے ہوئے زخموں نے مِرا حال سنایا
ان زخموں کو مرہم ہی بنا لیتی تو اچھا تھا

O

اک لفظ بھی نظر نہیں آتا کتاب میں
یہ کیا لکھا ہوا ہے محبت کے باب میں

دنیا کی فکر میں بھلا دیوانی کیا کروں
آتی نہیں یہ چیز تو میرے حساب میں

اب چاندنی سے کوئی گلہ ہی نہیں رہا
چہرہ نظر جو آیا ترا ماہتاب میں

خط کے جواب نے مجھے حیران کر دیا
اب سوچتی ہوں کیا لکھوں تجھ کو جواب میں

تتلی کو دیکھ اس کو پکڑنے کی جستجو
ہوتا سبھی کے ساتھ ہے دَورِ شباب میں

احوال دل کا دل کے سوا کون جانتا
گزری جو ہم پہ وہ نہ لکھی تھی نصاب میں

توڑا تھا پھول شاخ سے تیرے خیال میں
محفوظ اس کو کر لیا دل کی کتاب میں

○

ساری امیدیں توڑ کر رکھ دیں
میں نے آنکھیں نچوڑ کر رکھ دیں
تیری جانب رواں تھے سب رستے
وقت نے راہیں موڑ کر رکھ دیں

O

بات پرانی ہو جاتی ہے
ایک کہانی ہو جاتی ہے

آس کی ٹوٹی ڈوری اک دن
پیار نشانی ہو جاتی ہے

ماں کے آنسو تکتے تکتے
بیٹی سیانی ہو جاتی ہے

اک خواہش کے پیچھے پیچھے
صَرف جوانی ہو جاتی ہے

جیون جوتی جلتے جلتے
برف سے پانی ہو جاتی ہے

○

صدمے اٹھائے پیار میں ہم نے کچھ اس طرح
ہر گل کا گلستاں میں جگر چاک ہو گیا

اس نے بھی رابطے کا تردد نہیں کیا
ہم بھی کچھ ایسے روٹھے کہ سب خاک ہو گیا

○

انوکھا کام کرنا چاہتی ہوں
زمانے کو بدلنا چاہتی ہوں

گھٹائیں جھوم کر اٹھی ہیں مجھ میں
میں بارش ہوں، برسنا چاہتی ہوں

ستم کو، جور کو، سب نفرتوں کو
محبت سے نمٹنا چاہتی ہوں

ہوا جو نذرِ طوفاں آشیانہ
میں اس میں پھر سے بسنا چاہتی ہوں

خطا کس سے بھلا ہوتی نہیں ہے
گری ہوں تو سنبھلنا چاہتی ہوں

O

درد کیوں اس قدر زیادہ ہے
آسماں ! کیا ترا ارادہ ہے
صرف دامن ہی تنگ ہے اپنا
ورنہ دل تو بہت کشادہ ہے

O

کوئی چلنا سکھا گیا مجھ کو
کوئی رستہ بنا گیا مجھ کو

روشنی کا جو استعارہ تھا
وہی جگنو جلا گیا مجھ کو

خواب آنکھوں میں بھر کے بیٹھی ہوں
کوئی سپنا دکھا گیا مجھ کو

مسکرا کر جو بات کرتا تھا
وہی لہجہ رُلا گیا مجھ کو

زندگی ریت ہوتی جاتی ہے
کوئی صحرا بنا گیا مجھ کو

○

لوٹ آئی ہے صدا چھیڑ کے دیواروں کو
یاد کیا آئی تِری، چھو لیا انگاروں کو
ابنِ مریم ہے، صلیبیں ہیں، کہیں آہ و بکا
کون آئے گا یہاں دیکھنے بیماروں کو

○

یونہی وفاؤں کے چرچے نہیں زمانے میں
ہے خونِ دل بھی تو شامل مِرے فسانے میں

تمھارے ہاتھ میں سورج بھی ہے، چراغ بھی ہے
پھر اتنی تیرگی کیسے ہوئی زمانے میں

ہمیں تو بچھڑے ہوئے بھی کئی زمانے ہوئے
ہمارا ذکر کیوں آیا تِرے فسانے میں

ذرا سی بات پہ وہ روٹھ کر چلا بھی گیا
اب ایک عمر لگے گی اسے منانے میں

ہمارے ساتھ یہ لفظوں کا کھیل مت کھیلو
ہمیں یہ علم ہے ماہر ہو تم ہرانے میں

O

سو پردوں میں ہم نے تو رکھا تھا محبت کو
اب پیار کی خوشبو نے اک دھوم مچائی ہے

ہے راز کھلا سب پر اب اپنی محبت کا
بن چاہے کہانی یہ سب کو ہی سنائی ہے

○

تیر باہر ہے، میں کمان میں ہوں
روح اندر ہے، میں جہان میں ہوں

وہ گیا ہے تو لوٹ آئے گا
آج تک میں اسی گمان میں ہوں

تو کہاں کھو گیا ہے جانِ جہاں
میں تو اب تک ترے دھیان میں ہوں

میری آنکھیں بھی اب تو مخبر ہیں
چھپ کے بیٹھی ہوئی زبان میں ہوں

گونگی بہری ہیں گھر کی دیواریں
دشت میں ہوں کہ میں مکان میں ہوں

○

مجھے اُڑنے کی خواہش تھی
مگر زنجیر ہونا تھا

میں رانجھے سے کہاں ملتی
مجھے تو ہیر ہونا تھا

O

رفاقتوں کے زمانے ہنساتے رہتے ہیں
جدائیوں کے زمانے رُلاتے رہتے ہیں

تمھاری آنکھ میں تِل دیکھ کر نہ جانے کیوں
عجیب وہم سے مجھ کو ڈراتے رہتے ہیں

تلاشِ خواب میں راتوں سے دوستی کر لی
اندھیرے رات کے پھر بھی ڈراتے رہتے ہیں

ہمیں کچھ ایسی ضرورت نہیں ہے اشکوں کی
تمھاری یاد میں ساون مناتے رہتے ہیں

کسی کے ہاتھ کے لمس اب بھی چپکے چپکے سے
رفاقتوں کی کہانی سناتے رہتے ہیں

وہ شام ہے کہ سحر، فرق ہی نہیں پڑتا
تمھاری یاد کی شمعیں جلاتے رہتے ہیں

○

یوں دُوریوں کی آگ میں اب نہ جلا مجھے
معلوم بھی تو ہو کوئی اپنی خطا مجھے

باتیں ہزار آ کے لبوں پر ٹھہر گئیں
کہتی میں کیا کہ اس نے بھی کچھ نہ کہا مجھے

وہ گم تھا اپنی ذات کے صحرا میں اس طرح
کچھ دیر کو بھٹک گئی میں بھی، لگا مجھے

وہ چاند تھا گھٹاؤں میں چھپتا چلا گیا
میں چاندنی تھی، ہونا تھا آخر جدا مجھے

موقع ملے ملے، نہ ملے سوچنا ہے کیا
میں تو نمازِ عشق ہوں، کر لو ادا مجھے

○

ابھی تو بات مِری ختم ہو نہ پائی تھی
مِرے دوانے کو جلدی تھی کتنی جانے کی

ادھوری بات کسے جا کے ہم سنائیں گے
کبھی نہ بولیں گے اب ہم، قسم زمانے کی

○

میں اپنی کشتیِ دل کو ڈبو نہیں سکتی
سمندروں سے عداوت تو ہو نہیں سکتی

میں کیسے تجھ سے بچھڑ جاؤں، یہ بتا مجھ کو
جدا گلاب سے خوشبو تو ہو نہیں سکتی

نہ کوئی حال، نہ ماضی، نہ کوئی مستقبل
میں خود میں کوئی زمانہ سمو نہیں سکتی

تری جدائی کو دل میں اتار رکھا ہے
نشانی پیار کی ہر گز میں کھو نہیں سکتی

سفینہ پیار کا ساحل پہ اب لگے ہی لگے
کوئی بھی لہر اب اس کو ڈبو نہیں سکتی

جو فصل کانٹا میرے نصیب میں ہی نہ ہو
میں ایسی فصل کے اب بیج بو نہیں سکتی

○

بہتر ہے کہ تم وقت کی رفتار کو دیکھو
گر چاک گریباں ہو تو دستار کو دیکھو
شوریدہ سمندر ہے، غضب ناک ہوائیں
طوفانِ بلا خیز ہے، پتوار کو دیکھو

O

میری راتیں ہیں کہ احساس پہ چلتی آری
میری صبحیں تو ہیں اب نور سے خالی ساری

عمر بھر دار پہ لٹکی ہوں تمھاری خاطر
اب تو مقتل میں ہے جانے کی تمھاری باری

خواب رستے میں ہی دم توڑ رہے ہیں اب تو
نیند آوارہ ہے کہ اب پھرتی ہے ماری ماری

رات آتی ہے تو پلکوں کو جلا دیتی ہے
آگ کا کھیل ہے اب آنکھ میں جاری ساری

دل دھڑکتا ہے تو نبضیں بھی پھڑک اٹھتی ہیں
سانس رکتی ہے تو لگتا ہے ہماری باری

O

ملے تو تھے بڑے مانوس موسموں میں مگر
جدا ہوئے تو شناسا کوئی بھی رنگ نہ تھا

خزاں نے پیار کے سب نقش یوں مٹا ڈالے
کہ تیری یاد کا سایہ بھی میرے سنگ نہ تھا

○

سانپ سے رستے لہراتے ہیں
لوگ سفر پر کیوں جاتے ہیں

سات سمندر پار کیے ہیں
اشکوں سے کیوں گھبراتے ہیں

اس پر زور کہاں چلتا ہے
اپنے آپ کو سمجھاتے ہیں

لمحے چند ملاقاتوں کے
کتنی یادیں دے جاتے ہیں

نیند کی پریاں روٹھ گئی ہیں
دن کو خواب نظر آتے ہیں

ہمیں خوشی گھائل کرتی ہے
لوگوں کو دُکھ تڑپاتے ہیں

○

آواز یہ آتی ہے الفت کے مزاروں سے
ڈولی نہ اٹھائیں اب، کہہ دو یہ کہاروں سے
جسموں کا ملن کیسا، یہ روحوں کا سنگم ہے
ملنا ہو جنھیں آخر، مل جاتے ہیں پیاروں سے

○

سمندر آگ بن جائیں تو اشکوں سے بجھا ڈالوں
ہوائیں برق بن جائیں تو آہوں سے جلا ڈالوں

مِرا چہرہ، مِرے بازو مجھے اپنے نہیں لگتے
اگر تیری اجازت ہو، نیا اک بُت بنا ڈالوں

محبت زخم ہے تو ڈھونڈ کر لاؤ کوئی مرہم
وگرنہ درد کے رستے کو پھولوں سے سجا ڈالوں

وفائیں ہاتھ ملتی ہیں، جفائیں مسکراتی ہیں
نہ کیوں میں سلسلے ایسے زمانے سے مٹا ڈالوں

کٹی شاخوں پہ بھی اب تک پرندے روز آتے ہیں
کہیں ایسا نہ ہو میں اِن پرندوں کو اُڑا ڈالوں

○

درد دو شالہ اوڑھ چکی ہوں
سُکھ کی نگری چھوڑ چکی ہوں

جینا مجھ کو راس نہ آیا
موت سے رشتہ جوڑ چکی ہوں

بیچ سمندر پیاسی پیاسی
جام و سبو سب توڑ چکی ہوں

○

یہ بدلی اس طرح سے چھٹ رہی ہے
کہ جیسے رخ سے چلمن ہٹ رہی ہے

نہیں حاصل پشیمانی سے کچھ بھی
جو کھیتی بوئی تھی، وہ کٹ رہی ہے

ستم کا بوجھ بڑھتا جا رہا ہے
زمیں محور سے اپنے ہٹ رہی ہے

لکھا دیوار پر دیکھا تھا میں نے
زمانے سے محبت گھٹ رہی ہے

نہیں آساں مسافت زندگی کی
جبیں مٹّی سے سب کی اَٹ رہی ہے

صدا آئی چراغوں کو بجھا دو
گھٹا تاریکیوں کی چھٹ رہی ہے

○

ہمیں تسلیم کرنا پڑ گیا ہے
یہ گھر تقسیم کرنا پڑ گیا ہے

تمھارے خط کو برسوں پڑھتے پڑھتے
کئی سوچوں میں اب دل پڑ گیا ہے

○

لرزتے کانپتے سے اک مکاں کی
گری دیوار اور اب در گیا ہے

مِرے کمرے میں یادوں کے اُجالے
کوئی چپکے سے آ کے کر گیا ہے

سنا ہے لوگ کہتے پھر رہے ہیں
"یہاں جو ڈر گیا، وہ مر گیا ہے"

○

جس شاخ پہ اپنا ڈیرا تھا
وہ شاخ تو کب کی ٹوٹ گئی

جو مہندی تیرے نام کی تھی
وہ ہاتھ سے کب کی چھوٹ گئی

جس چاہت کا دم بھرتے تھے
وہ چاہت ہم کو لوٹ گئی

○

وعدے محبتوں کے کچھ ایسے نبھائے ہیں
آنکھوں میں اشک آئے مگر مسکرائے ہیں

خوشبو ترے وصال کی پھیلی ہے چار سو
کن کن جگہوں پہ تو نے ٹھکانے بنائے ہیں

آنسو لہو میں ڈوب گئے تو خبر ہوئی
طوفان دل نے درد کے کیا کیا اٹھائے ہیں

تیری محبتوں کے نشے بھی عجیب ہیں
ہم ہوش میں تھے پھر بھی قدم لڑکھڑائے ہیں

پکے مکاں کی وحشتوں کو دیکھ دیکھ کر
اب ہم نے خواہشوں کے گھروندے بنائے ہیں

یہ زندگی کسی کی امانت ہے دوستو
گِن کے بتاؤ جتنے بھی لمحے گنوائے ہیں

شامِ غریباں تم نے تو دیکھی نہیں کبھی
بس اِس خیال سے ہی تمھیں دُکھ سنائے ہیں

O

الجھی الجھی دنیا اپنی ذات کے اندر کیسی ہے
شاید چاند میں چرخہ کاتنے والی بڑھیا جیسی ہے
دھرتی کے سب رنگوں میں جب اس کا نور ظہور ہوا
سوچوں کی بے رنگی پھر بھی کیوں ویسی کی ویسی ہے

○

کہا زمین سخت ہے
کہا یہ تیرا بخت ہے

کہا یہ دل کی چاندنی
کہا کسی کا تخت ہے

کہا کتاب اور پھول
کہا سوال سخت ہے

کہاں گھڑی وصال کی
کہا یہ سب ہی رفت ہے

کہاں یہ کیا جہان ہے
نہ بود ہے، نہ ہست ہے

O

سوتی جاگتی راتوں میں
نینوں کی برساتوں میں
سپنے سارے دھول ہوئے
من سے من کی باتوں میں

○

”مرے خدایا! میں زندگی کے عذاب لکھوں کہ خواب لکھوں“[1]
یہ کیا سوالات سامنے ہیں، میں کیسے ان کے جواب لکھوں

جوان چہرے لٹے لٹے سے، نظر کی شمعیں بجھی بجھی سی
نشے سے اجڑی جوانیوں کو میں کیسے عہدِ شباب لکھوں

میں ظلم کو ظلم ہی لکھوں گی، میں رات کو رات ہی لکھوں گی
میں ریت کو لہر کیسے کہہ دوں، ندی کو کیسے سراب لکھوں

۱۔ عبیداللہ علیم کی نظم ”چاند چہرہ ستارہ آنکھیں“ کے پہلے مصرع کی زمین میں لکھی گئی ہے۔

ہے کی مٹھی میں بند چٹھی سوال جس کے مجھے پتا ہیں
میں کس ورق پر، میں کس قلم سے، سوال لکھوں، جواب لکھوں

وہ سامنے ہے تو کیسے کہہ دوں وہ میرے سامنے نہیں ہے
سراپا اس کا نظر میں ہے جب تو کیسے اس کو سراب لکھوں

جو دل کے مندر میں بُت رکھے تھے، انہی میں تیری بھی مورتی تھی
یہ بُت گرے جب جو دل پہ گزری، میں کیوں نہ اس پر کتاب لکھوں

○

خواب آنکھوں میں کچھ پرانے دو
مجھ کو گزرے ہوئے زمانے دو

اشک آنکھوں میں اب نہیں آتے
مجھ کو رونے کے کچھ بہانے دو

وہ تماشا بنا گیا مجھ کو
غم کا بازار اب لگانے دو

تیرے انساں نے کر دیا مایوس
مجھ کو اک بُت نیا بنانے دو

اب تو جینا بھی موت لگتا ہے
مجھ کو اپنی چِتا سجانے دو

○

میرے خوابوں کو حقیقت میں بدلنے والے
آ ترے چہرے کی سو بار بلائیں لے لوں

غم کے بادل نہ کبھی اتریں تری آنکھوں میں
دامنِ دل پہ تری ساری بلائیں لے لوں

O

یاد آئی تری جدائی کی
آج اشکوں نے بے وفائی کی

کیا عجب اس کو بھی وفا نہ ملی
جس کو عادت تھی بے وفائی کی

ہم نے آنکھیں اٹھا کے دیکھا نہیں
کتنی نظروں نے پارسائی کی

پیار کی قید میں ہی رہنے دو
بات کرتے ہو کیوں رہائی کی

صنفِ نازک ہوں، اس لئے شاید
سب نے ہی مجھ سے آشنائی کی

تو مکاں میں بھی، لامکاں میں بھی
حد کہاں ہے تری خدائی کی

○

اب تو جذبوں کی حکمرانی ہے
بس یہی پیار کی نشانی ہے

آنکھ کیوں راز کھول دیتی ہے
کیا کہانی اسے سنانی ہے

میرے لہجے میں جراُتوں کی کھنک
میرے پُرکھوں کی اِک نشانی ہے

لوگ اب تک سوال کرتے ہیں
کیا کہیں، بات اب پرانی ہے

میرے چہرے پہ بولتا صحرا
تیرے ہی پیار کی نشانی ہے

میری آنکھوں میں ہولی، دیوالی
پیار کی ہر ادا سہانی ہے

○

کچھ حسین یادوں کو طاق پر سجا لوں گی
خواب میں جو ڈر جاؤں وحشتوں کے موسم میں

غم کے بوجھ سے اب تو چیختی ہیں دیواریں
کس طرح سے گھر جاؤں وحشتوں کے موسم میں

○

بجھے نہ دیپ جو تو نے ابھی جلایا ہے
ہواؤں نے مجھے پیغام یہ سُنایا ہے

ستم زمانے کے سب ہنس کے سہہ لیے ہم نے
تمھاری بات تھی جس نے ہمیں رُلایا ہے

ترِی وفاؤں کے حق دار کس طرح ہوتے
تجھے جو ہم نے دیا ہے، وہی تو پایا ہے

ہمارے رزق کو کیسے کوئی گھٹائے گا
نصیب میں جو لکھا تھا وہی تو پایا ہے

دلِ تباہ کی ہم داستان کیا کہتے
چراغ اپنے ہی ہاتھوں سے یہ بجھایا ہے

یہ کیسے شکوے گلے ہیں، شکایتیں کیسی
دلوں کے کھیل میں سب نے ہی کچھ گنوایا ہے

○

ڈھونڈیں کیسے من کا میت
ملنا، بچھڑنا پیار کی ریت

کوئل کی آواز میں پنہاں
درد کا ایک انوکھا گیت

عکس بھی تم، آئینہ بھی
کون ہے دشمن، کون ہے میت

برسوں بیتے اس کو دیکھے
کیسی نفرت، کیسی پریت

پیار ہے ایک انوکھا قصہ
کس کی ہار اور کس کی جیت

○

زندگی کا بھرم رکھ تو لیتے مگر
زندگی نے ہمیں ہے ستایا بہت

دھوپ نکلی کبھی جب رخِ زیست پر
غم کے بادل کا تھا اس پہ سایا بہت

○

وقتِ رخصت ابھی ہوا ہی نہیں
حرفِ آخر ابھی کہا ہی نہیں

یوں ہی باتوں میں بات کہہ ڈالی
دل تِری بات سے خفا ہی نہیں

کس لئے دار سے ڈراتے ہو
زندگی دار سے جدا ہی نہیں

وہ ملا بھی تو اجنبی کی طرح
اب تو اس سے کوئی گِلہ ہی نہیں

پھول کے ساتھ خار ہوتے ہیں
پھول تنہا کبھی کِھلا ہی نہیں

ایسا لمحہ جو زندگی دے دے
ویسا لمحہ کبھی مِلا ہی نہیں

○

اس کا رستہ مِرے رستے سے جدا ہو جیسے
''وہ سرِ راہ مِلا مجھ سے خفا ہو جیسے''

سارے بُت توڑ دیئے میں نے صنم خانے کے
اس کو نظروں میں بسایا کہ خدا ہو جیسے

خواہشیں چاک گریبان پھرا کرتی ہیں
''زندگی بھی کسی مفلس کی قبا ہو جیسے''

میں تو چلتے ہوئے یہ سوچ کے رُک جاتی ہوں
وہ شرارت سے مِری رہ میں چھپا ہو جیسے

ٹوٹ کے اس طرح برسیں ہیں یہ پاگل آنکھیں
ایسے لگتا ہے کہ ساون کی گھٹا ہو جیسے

○

بہانہ روز ہی تم اک نیا ایجاد کرتے ہو
یہ تنکوں سے بنایا آشیاں برباد کرتے ہو
مجھے ہر روز کی بربادیوں سے خوف آتا ہے
نہ تم برباد کرتے ہو، نہ تم آباد کرتے ہو

○

ترے بغیر مِری زندگی ادھوری ہے
اسی لئے تو تجھے ڈھونڈنا ضروری ہے

میں سوچتی ہوں مِرا خواب تو مکمل تھا
نہ جانے خواب کی تعبیر کیوں ادھوری ہے

جو ابتدا تھی تو انجام بھی ہوا کوئی
بچھڑ گئے ہیں تو کیا داستاں تو پوری ہے

جو گفتگو ہے وہ دونوں طرف سے ہوتی ہے
میں سوچتی ہوں ترِی بات بھی ضروری ہے

میں لاشعور کو مانوں تو کس طرح مانوں
شعور میں ہے تو ہر چیز ہی شعوری ہے

کوئی حدیں ہی نہیں ہیں ترِی حکومت کی
جدھر نگاہ اٹھاؤں ترِی حضوری ہے

O

رات کی آنکھ میں سیاہی تھی
اس سیاہی میں ہی تباہی تھی

تیری نظروں میں پیار کے ساغر
میرے ہاتھوں میں بھی صراحی تھی

دُور شہنائی بج رہی تھی کہیں
بیٹی مفلس کی بن بیاہی تھی

میں نے خود کو چھپا لیا خود سے
اتنی لوگوں میں خود نمائی تھی

شہر میں وصل کے اُجالے تھے
اپنی قسمت میں ہی جدائی تھی

میں جنوں در جنوں بھٹکتی رہی
میری قسمت میں کب رسائی تھی

○

موم کے سائباں کو کڑی دھوپ میں
میں پگھلتے ہوئے دیکھتی رہ گئی

میری پلکوں پہ شبنم بھی شعلہ بنی
کیا سے کیا ہو گیا، سوچتی رہ گئی

○

انتظارِ بہار کرنا ہے
اب خزاؤں سے پیار کرنا ہے

نفرتوں سے وہ سر نگوں نہ ہوا
پیار سے زیر بار کرنا ہے

موت آئی تو اس سے کہہ دیں گے
جاؤ دیدارِ یار کرنا ہے

پھر خزاں کے اداس رنگوں کو
تجھ سے مل کر بہار کرنا ہے

قتل جس نے کیا ہے خوشبو کا
اب اسے سنگسار کرنا ہے

○

میں دیواروں کو گھر کہتی رہی ہوں
میں پتھر کو گُہر کہتی رہی ہوں

پرائی روشنی تھی آنکھ میری
میں اس کو ہی نظر کہتی رہی ہوں

میں ظلمت میں اُجالے کی کرن کو
زمانوں تک سحر کہتی رہی ہوں

مِری نظروں کا دھوکا تھا کہ جادو
میں روزن کو بھی در کہتی رہی ہوں

جو میرا بن نہ پایا زندگی بھر
میں اس کو ہم سفر کہتی رہی ہوں

○

رشتے دل کے، نظر کے خواب ہوئے
کیسے کیسے طلسم ٹوٹ گئے

روشنی، یاد، درد کے راہی
ساتھ سارے ہی رہ میں چھوٹ گئے

○

رستے نیند میں کھو جاتے ہیں
خواب پرائے ہو جاتے ہیں

آؤ دیکھو رات کے آنسو
کیسے جگنو دھو جاتے ہیں

دریا، ساحل اور سمندر
ملتے ملتے کھو جاتے ہیں

آپس کی ناچاقی چھوڑو
گھر ویرانے ہو جاتے ہیں

ساون، بھادوں، برکھا، بادل
آتے جاتے رو جاتے ہیں

رہتے رہتے اس دنیا میں
لوگ سیانے ہو جاتے ہیں

○

شامِ غم ہے، دھواں تو ہونا ہے
جتنا ہنستے تھے، اتنا رونا ہے

رات آنکھوں میں کاٹ دیتی ہوں
خواب کو غمزدہ تو ہونا ہے

خود کو پانے کی بات کیا سوچوں
تیری یادوں میں اب تو کھونا ہے

کوئی کب تک لڑے مقدر سے
جو بھی ہونا ہے، وہ تو ہونا ہے

کُل اثاثہ تو آدمی کا یہاں
بس یہی خاک کا بچھونا ہے

مائیں بچوں سے عشق کرتی ہیں
عشق میں امتحاں تو ہونا ہے

O

محبتوں کے وہ استعارے
وفا کے روشن چراغ سارے
چمکتی صبحیں، وصال شامیں
کہاں گئے وہ سبھی نظارے

O

کیوں مسیحا مِرے دردِ دل کی دوا ڈھونڈتا ہے
میں تو حیران ہوں، درد دے کے مجھے اب وہ کیا ڈھونڈتا ہے

روشنی میں اندھیرا، اندھیرے میں بھی روشنی کی کرن ہے
میں دیئے کو نہیں ڈھونڈتی، اب تو مجھ کو دیا ڈھونڈتا ہے

مرد و زن کے لئے شرم و غیرت حیا لازمی ہیں مگر
مرد جیسا بھی ہو، آنکھ میں عورتوں کی حیا ڈھونڈتا ہے

ٹوٹ کر دل کا شیشہ کبھی پھر سے جڑتا نہیں ہے
توڑ کر عکس سب وہ محبت بھری اک نگہ ڈھونڈتا ہے

حبس ایسا کہ دیوار و در کا بھی دم گھٹ رہا ہے
بات دیوار و در کی نہیں، اب دریچہ بھی بادِ صبا ڈھونڈتا ہے

O

میں نے لفظوں کا دل چیر ڈالا
دل میں پھر بھی ہوا نہ اجالا

خواب آنکھوں میں ٹوٹے پڑے ہیں
نیند کیسے انھیں دے سنبھالا

سسکیاں کوئی سنتا نہیں تھا
میں نے آہوں کو گیتوں میں ڈھالا

زندگی ہی کفن بن گئی ہے
موت کو منتوں سے ہے ٹالا

روتے روتے ہوئے ہنس پڑی ہوں
غم کا دستور بھی ہے نرالا

○

ہے سکونِ قلب لٹا ہوا، ہے حیات غم میں پھنسی ہوئی
تِرے فیصلوں کی کمان میں مِری جاں ہے کب سے کسی ہوئی

مِری دھڑکنوں میں بسا ہے تو، مِری چاہتوں میں رچا ہے تو
تِرے انتظار میں یہ نظر تِری راہ پر ہے لگی ہوئی

O

بدلے میں وفاؤں کے تم اور تو کیا دیتے
میری ہی وفاؤں کا تھوڑا سا صلہ دیتے

تحریر مٹا دی ہے، یہ ایک نشانی تھی
اس سے تو یہ اچھا تھا تقدیر مٹا دیتے

آئے تھے جو تربت پر، اتنا تو کیا ہوتا
دو پھول چڑھا دیتے، اک دیپ جلا دیتے

دل توڑ دیا تم نے، دل خون کیا ہوتا
اس خون کی رنگت سے تصویر بنا دیتے

یہ کون سی حالت میں تم چھوڑ گئے مجھ کو
یا مجھ کو ہنسا دیتے یا مجھ کو رُلا دیتے

ملنا تو حقیقت میں ہوتا ہے نصیبوں سے
ملنے کی کہانی ہی تم ہم کو سُنا دیتے

O

بے رحم ہواؤں کی نظر دیکھتے رہنا
کشتی کو ڈبو دیں نہ بھنور دیکھتے رہنا

ہر بام سے خورشید نکل آئے گا اک دن
مظلوم کی آہوں کا اثر دیکھتے رہنا

جس رات کی تقدیر میں لکھی تھی جدائی
اس رات کی بے کیف سحر دیکھتے رہنا

رستے ہیں کٹھن، ضبط کا یارا بھی نہیں ہے
کیا ہوتا ہے انجامِ سفر دیکھتے رہنا

○

اب اس نے بلایا ہے تو جانا ہی پڑے گا
بے نام سا رشتہ ہے، نبھانا ہی پڑے گا
آنکھیں مِری دیواریں تو آنسو ہیں دریچے
اب درد کا اِک شہر بسانا ہی پڑے گا

O

کیا بات سنائیں لوگوں کو، ہم سب کی کہانی ایک سی ہے
اب کس کس بات کو یاد کریں، ہر بات پرانی ایک سی ہے

کچھ یادیں ہیں، فریادیں، کچھ آنسو ہیں، کچھ آہیں ہیں
لہروں کا تلاطم ایک سا ہے، دریا کی روانی ایک سی ہے

جو چہرے اُجلے اُجلے تھے، جو آنکھیں روشن روشن تھیں
سب جلتی بجھتی آنکھیں ہیں، وہ جوت نشانی ایک سی ہے

کچھ آنکھیں ہیں، کچھ سپنے ہیں، کچھ خواب ہیں بکھرے بکھرے سے
تعبیریں ڈھونڈتی خوابوں کی، مجبور کہانی ایک سی ہے

ہر مفلس کو تو روشن دن بھی شامِ غریباں لگتا ہے
زر داروں کی، زر والوں کی ہر شام سہانی ایک سی ہے

○

جھکی نگاہ اٹھاؤں تو روشنی پھیلے
نظر نظر سے ملاؤں تو روشنی پھیلے

بہت اندھیرا ہے اس بے وفا زمانے میں
وفا کی شمع جلاؤں تو روشنی پھیلے

حقیقتوں کی شناسا ہوں، پھر بھی آج کی شب
اگر فسانہ سناؤں تو روشنی پھیلے

جو شاخ پیڑ سے کٹ کر کبھی ہری نہ ہوئی
اسے شجر پہ سجاؤں تو روشنی پھیلے

مِرے جہان میں تاریکیوں کا ڈیرا ہے
نئے جہان میں جاؤں تو روشنی پھیلے

○

چھوٹی چھوٹی خوشیاں ہی تو جیون کا سرمایہ ہیں
بڑی خوشی کی آس میں کب تک ان کو تم ٹھکراؤ گے

گزرا وقت ہے ایک سمندر جس کا کنارہ کوئی نہیں
بیتے دنوں کی یاد میں کب تک اس میں غوطے کھاؤ گے

○

شب کے آنگن میں بھی اداسی تھی
رات میری طرح ہی پیاسی تھی

اس کا جانا ٹھہر گیا تھا بس
بات کچھ بھی نہ تھی، ذرا سی تھی

کون کہتا ہے ہم نہیں بچھڑے
گھر میں کیوں اس قدر اداسی تھی

اپنی قیمت لگا نہ پائی میں
مجھ میں کب اتنی خود شناسی تھی

ایسے کرب و بلا سے گزری ہوں
زہر کا تیر ہی خلاصی تھی

O

پیار کرنا ہے، پیار کرنا ہے
یہ گنہ بار بار کرنا ہے

چند لمحوں کے پیار کی خاطر
پھر ہمیں دل فگار کرنا ہے

وہ کسی موڑ پر بچھڑ جائے
ہم کو تو انتظار کرنا ہے

اس نے کب ہم کو پیار سے دیکھا
اب تو یہ بھی شمار کرنا ہے

کیوں اُسے بھی سکوں میسر ہوں
اب اُسے بے قرار کرنا ہے

ہر گھڑی میں تو سوچتی ہوں یہی
دشتِ تنہائی پار کرنا ہے

○

پاؤں دھرتی پہ نہ ٹکتے تھے حسیں خوابوں میں
اب قدم رکھوں تو دھرتی کو سلگتا دیکھوں

جذبۂ شوق میں یہ حال ہوا ہے اپنا
پھول کے لمس میں شعلہ سا لپکتا دیکھوں

O

سب کو رزقِ زمین ہونا ہے
منتظر خاک کا بچھونا ہے

جو بھی کرتے ہیں اس جہاں میں ہم
اس کا آخر حساب ہونا ہے

موت ہے زندگی ہمیشہ کی
کیسے آنسو، یہ کیسا رونا ہے

مفت میں دل فگار کرتے ہو
دل کو آخر تباہ ہونا ہے

جم گئے آنکھ میں کہیں آنسو
برف پگھلی تو سب ڈبونا ہے

پاؤں منزل سے آگے جا نکلے
راستوں کا یہی تو رونا ہے

O

چپ کا دریا ہے اور بہتا نہیں
سب سمجھتے ہیں، کوئی کہتا نہیں

پتھروں کے نگر میں آ نکلی
کوئی انساں یہاں پہ رہتا نہیں

اپنے حصے کے دُکھ اٹھانے ہیں
کوئی پیڑیں پرائی سہتا نہیں

خواب بارش میں ڈُھل گئے سارے
کوئی کاغذ کے گھر میں رہتا نہیں

دل کی سنسان سی حویلی کو
اب حویلی بھی کوئی کہتا نہیں

غم کی شدّت سے منجمد ہے دل
اب تو خوں بھی رگوں میں بہتا نہیں

○

بیچ سمندر رہنا ہو گا
ساگر کا دُکھ سہنا ہو گا

خاموشی تو بول رہی ہے
ہم کو بھی کچھ کہنا ہو گا

وقت کا آرا کاٹ رہا ہے
خون کو آخر بہنا ہو گا

○

کیوں بادل مینہ برساتے ہیں
کیوں آنکھ میں آنسو آتے ہیں

کیوں ساگر شور مچاتے ہیں
کیوں دل میں طوفاں آتے ہیں

کیوں ہجر کی لمبی راتوں میں
ہم آس کے دیپ جلاتے ہیں

کیوں پیار کسی سے ہوتا ہے
کیوں پردیسی یاد آتے ہیں

کیوں یاد تمھاری آتی ہے
کیوں لمحے شور مچاتے ہیں

کیوں تانیں میری ٹوٹ گئیں
کیوں بھولے گیت رُلاتے ہیں

کیوں جیون کی سونی راہیں
ہم یادوں سے مہکاتے ہیں

O

میرے آنسو مری زباں بنتے
میرے جذبوں کے ترجماں بنتے
میرے دل کی اجاڑ بستی میں
تیری یادوں کا کارواں بنتے

○

داغِ ندامت دھونے دے اب
اپنا آپ بھگونے دے اب

ڈوبوں، ابھروں، پھر سے ڈوبوں
اپنا آپ ڈبونے دے اب

ہم نے تجھ کو پیار کیا ہے
پیار میں ہم کو رونے دے اب

ذات کی ندیا کب سے پیاسی
عشق سمندر ہونے دے اب

سب دروازے بند پڑے ہیں
من ہی من میں کھونے دے اب

من کی چاندی نکھری نکھری
جل کر سونا ہونے دے اب

○

جسے ذرّہ سمجھتے ہو، کہیں خورشید ہی نہ ہو
کہ ذرّے سے جہاں بننے میں کتنی دیر لگتی ہے

مکاں کو گھر بنانے میں تو عمریں بیت جاتی ہیں
مگر گھر کو مکاں بننے میں کتنی دیر لگتی ہے

○

دریا سے کیا ڈرنا ہے
جب پار سمندر کرنا ہے

خود غرضوں کی اس دنیا میں
موت سے پہلے مرنا ہے

اشکوں کے انگاروں میں
خوابوں کو جل مرنا ہے

جیون دان دیا ہے جس نے
اس کو واپس کرنا ہے

ہاتھ کی خالی ریکھاؤں میں
خوشیوں کو ہی بھرنا ہے

توڑ کے دیواروں کا جنگل
صحرا صحرا کرنا ہے

○

تمھاری یاد کا روشن جو باب ہوتا ہے
نظر کے سامنے اک ماہتاب ہوتا ہے

میں کیسے دیکھتی مڑ کر نشان قدموں کے
پلٹ کے دیکھا کتنا عذاب ہوتا ہے

کبھی میں ڈھونڈ لوں خود کو جو ایک لمحے کو
وہ لمحہ نام ترے انتساب ہوتا ہے

کنارے پلکوں کے بھیگیں تو دل یہ کہتا ہے
یہ کون جانے کہ کیا زیرِ آب ہوتا ہے

میں نکلوں جب بھی تِری یاد کے گلستاں میں
ہجومِ لالہ و گل ہم رکاب ہوتا ہے

اداسیوں سے کسی کی اداس ہو جانا
دلوں کا یہ بھی انوکھا حساب ہوتا ہے

○

بھولی بسری دل میں کوئی یاد اترتی ہے
شہرِ خموشاں میں جیسے اک رات اترتی ہے

آنکھ سے آنسو ہولے ہولے دل پر گرتے ہیں
جیسے جیسے یادوں کی بارات اترتی ہے

○

"کہا، وفا کی بات ہے"
کہا، سزا کی بات ہے

کہا، میں زخم زخم ہوں
کہا، جفا کی بات ہے

کہا، یہ اتنا فاصلہ
کہا، حیا کی بات ہے

کہا، جھکی جھکی نظر
''کہا، ادا کی بات ہے''

کہا، گلوں میں تازگی
کہا، صبا کی بات ہے

کہا، یہ پھول پتیاں
''کہا، ہوا کی بات ہے''

کہا، یہ جسمِ ناتواں
''کہا، فنا کی بات ہے''

کہا، کہ میری نیکیاں
''کہا، بقا کی بات ہے''

کہا، کہ پیار ہو گیا
''کہا، سزا کی بات ہے''

(عدیم ہاشمی کی زمین میں)

○

ہمیں آغاز کرنا ہے کسی انجام سے پہلے
سحر کو شام کرنا ہے کسی الزام سے پہلے

ہمارے عہد کے انسان تو خوابوں میں رہتے ہیں
انھیں بیدار کرنا ہے کسی کُہرام سے پہلے

ہمارے نام کی تختی نہ ڈھونڈو تم مکانوں پر
جہاں میں لوگ گزرے ہیں بہت گمنام سے پہلے

مکاں پکے ہوں یا کچے، ہمیں اس سے غرض کیا ہے
ہمیں تو کوچ کرنا ہے یہاں بسرام سے پہلے

زباں کے زہر کا تریاق دنیا میں نہیں ملتا
تعلق توڑ لینا تم کسی دُشنام سے پہلے

○

غم کا آشوب پہاڑوں کو ہلا دیتا ہے
غم کا آشوب فرشتوں کو رُلا دیتا ہے
غم کی آنکھوں میں کبھی ڈال کے دیکھو آنکھیں
یہ وہ جذبہ ہے جو خالق سے ملا دیتا ہے

○

سچ کہنے پہ مجبور ہیں، پتھر ہمیں مارو
ہم وقت کے منصور ہیں، پتھر ہمیں مارو

ہم ذات کے صحرا سے نکل پائیں تو کیسے
ہم خود سے بھی مفرور ہیں، پتھر ہمیں مارو

ہم وقت کی تختی پہ ہیں اک نقطے کی مانند
پھر کس لئے مغرور ہیں، پتھر ہمیں مارو

ہاتھوں کی لکیروں میں سبھی قید ہوئے ہیں
محصور ہیں، مجبور ہیں، پتھر ہمیں مارو

گمنامی بھی اس دور میں نعمت ہے خدا کی
ہم کس لئے مشہور ہیں، پتھر ہمیں مارو

O

وادی وادی، پربت پربت پھیل چکے افسانے ہیں
جن کو چاہا جان سے بڑھ کر وہ کتنے انجانے ہیں
روح جلائی، دل سلگایا، دھواں نہ دیکھا اس نے
شاید اس کے ہم سے بڑھ کر اور بھی کچھ دیوانے ہیں

O

منجمد خواب ہیں، اک روز پگھل جائیں گے
آنکھ سے ہاتھ چھڑائیں گے، بچھڑ جائیں گے

کب تلک تیز ہواؤں کا میں رستہ روکوں
پھول تو پھول ہیں، اک روز بکھر جائیں گے

موت کا خوف جنھیں ہو گا، انھیں ہی ہو گا
''ہم تو دریا ہیں سمندر میں اتر جائیں گے''[1]

۱۔ احمد ندیم قاسمی-تصرف کے ساتھ

○

ہنستے ہوئے لوگوں کو رُلایا نہیں کرتے
روتے ہوئے لوگوں کو ستایا نہیں کرتے

اس درد کے صحرا میں تو لیلیٰ ہے نہ محمل
افسانے غمِ دل کے سنایا نہیں کرتے

وہ آیا مگر ایسے کہ جھونکا ہو ہوا کا
جانے کا ارادہ ہو تو آیا نہیں کرتے

نقشِ کفِ پا دیکھ کے کچھ سوچ رہے ہیں
ہم اپنوں کو مہمان بنایا نہیں کرتے

سوچا تھا اسے پہلا ملن یاد تو ہو گا
پر بیتے سمے لوٹ کے آیا نہیں کرتے

○

گزرے زمانے یاد آتے ہیں
اس کے بہانے یاد آتے ہیں

جب بھی کسی نے پیار سے دیکھا
زخم پرانے یاد آتے ہیں

اپنوں نے وہ درد دیا ہے
لوگ بگانے یاد آتے ہیں

اتنی تلخ حقیقت دیکھی
مجھ کو فسانے یاد آتے ہیں

دیکھ کے تیری آنکھ کے موتی
مجھ کو خزانے یاد آتے ہیں

بچپن کے معصوم دنوں کے
کھیل پرانے یاد آتے ہیں

○

پل پل مرنے سے بہتر ہے
جیون کو اک سانس میں پی لوں

کس نے دیکھا کل کا سورج
چاند نگر میں آج ہی جی لوں

O

کہو، غم کے سفینے کس طرف بہتے ہوئے دیکھے
کہا، دل کے سمندر کی طرف بڑھتے ہوئے دیکھے

کہو، غمگین چہرے پر تمھیں کیسی لگی آنکھیں
کہا، ویراں سرائے میں دیئے جلتے ہوئے دیکھے

کہو، انسان کے غم میں کبھی غمگیں ہوئے تم بھی
کہا، آنسو فلک کی آنکھ سے گرتے ہوئے دیکھے

کہو، جب بھی پکارا ہے ترے بندوں نے مشکل میں
کہا، دریا محبت کے سبھی بہتے ہوئے دیکھے

کہو، انسان کی قسمت میں مرنا کس لئے لکھا
کہا، پاؤں ہواؤں کے کبھی رکتے ہوئے دیکھے

○

ابھی تو حرف کو تحریر کی پہچان ہونا ہے
ابھی تو آدمی کو لفظ کا عرفان ہونا ہے

ابھی سے تھک گئے پاؤں، ابھی جاں ہار بیٹھے ہو
ابھی تو راستوں کو منزلوں کی جان ہونا ہے

کمندیں ڈال کر تم مہر و مہ پر بھول بیٹھے ہو
ابھی تو آدمی کو بھی یہاں انسان ہونا ہے

لبادہ اوڑھ کر مذہب کا کس کس کو ڈراؤ گے
ابھی تو دین کہتا ہے مجھے ایمان ہونا ہے

فقط دو بول ہی کافی نہیں رشتوں کے بندھن کو
ابھی تک جسم ہیں دونوں، انھیں یک جان ہونا ہے

O

کوئی دل کی شمع بجھا گیا
مجھے آنکھ آنکھ رُلا گیا
مِرے ہاتھ میں جو گلاب تھے
انھیں جاتے جاتے گِرا گیا

فردیات/اکائیاں

میں دائروں کے سفر کو تمام کرتی ہوں
سحر تو ہوتی نہیں، شام شام کرتی ہوں

دن تو جیسے بھی کٹا، کٹنا ہی تھا، سو کٹ گیا
اب ردا اوڑھے ہوئے بیٹھی ہوں سر پر شام کی

یہ آئینوں کے مقدر میں کیسی رات آئی
کہ اب تو عکس بھی ان میں نظر نہیں آتا

خواہشِ دید کو آنکھوں میں سمیٹے کب سے
میں وہیں ہوں تو جہاں چھوڑ گیا تھا مجھ کو

طاق پر رکھا چہرہ ایک روز بولے گا
آنکھ پر جو گزری ہے سارے راز کھولے گا

کتنے موسم گزر گئے اب تو
پھر بھی یادوں کا عکس باقی ہے

عورت ہوں، مِرا نام ہواؤں پہ لکھا ہے
بارش ہوں، مِرا نام گھٹاؤں پہ لکھا ہے

کہا میں نے، بتا دُکھ کا سمندر کتنا گہرا ہے
جواب آیا، وہاں تو رات دن اشکوں کا پہرا ہے

سوچ کے زاویے یوں بدلتے رہے
جیسے مٹھی میں جگنو چمکتے رہے

ان گنت خواب ہیں پلکوں پہ سجانے کے لئے
ان گنت خواب ہیں اشکوں میں بہانے کے لئے

کہا میں نے، ترے آکاش پر کتنے ستارے ہیں
جواب آیا، ستاروں نے مقدر بھی سنوارے ہیں

خواب جلتے ہیں تو پلکوں سے دھواں اٹھتا ہے
خواب روتے ہیں تو اشکوں سے دھواں اٹھتا ہے

کہا میں نے، ہوائیں اس طرح کیوں رُخ بدلتی ہیں
جواب آیا، یونہی پل بھر میں تو نظریں بدلتی ہیں

میں نے آنکھوں کے دریچوں میں جلائیں شمعیں
تو نہیں آیا تو اشکوں سے بجھائیں شمعیں

کہا میں نے، دلوں کے کھیل کیوں اتنے نرالے ہیں
جواب آیا، شکستہ دل بھی تو ہم نے سنبھالے ہیں

گرتی ہوئی دیوار کو اب کون سنبھالے
ہر روز کے بیمار کو اب کون سنبھالے

زخموں سے شہرِ دل کو سجاتی چلی گئی
میں سلسلے وفا کے نبھاتی چلی گئی

خواب آنکھوں میں ٹھہر جائیں، یہ ممکن ہی نہیں
ہم نے آنکھوں میں بسا رکھی ہے صورت تیری

زیست کا زہر پی لیا میں نے
اپنے حصے کا جی لیا میں نے

مِرے آنسو ہیں اک مدت سے پیاسے
میں اب جی بھر کے رونا چاہتی ہوں

مِرے وجود میں اک شور ہے بگولوں کا
میں اپنی ذات کے صحرا میں قید ہوں جیسے

ریزہ ریزہ ہیں خواب آنکھوں میں
راستہ نیند کو نہیں ملتا

چلوں تو کاروانِ فکر ساتھ چلے
رکوں تو منزلیں بھی رُک کے انتظار کریں

میں تشنہ لب ہوں اک مدت سے جاناں
سمندر میں بھی صحرا ہو گئی ہوں

ڈال ڈال زخمی ہے، پات پات آنسو ہیں
تتلیاں نہ مر جائیں وحشتوں کے موسم میں

نظمیں

حسنِ ترتیب

میں نے جب لکھنا سیکھا

آنکھیں بھی کیا خوب ہیں، ایک بار کھلتی ہیں تو موت پر ہی بند ہوتی ہیں۔ کھلنے اور بند ہونے کے درمیانی عرصے میں سوتی جاگتی آنکھیں کیا کچھ اپنے اندر سمو لیتی ہیں۔ یہ نہ صرف دل و ذہن کو چہرے پر لے آتی ہیں بلکہ پورا وجود ہی آنکھ کی پتلی میں سمٹ آتا ہے۔

اگر ان سے رنگ و نور کے چشمے پھوٹتے ہیں تو باہر کے رنگوں کو بھی ہر لمحہ یہ اپنے اندر سموتی رہتی ہیں۔ کبھی آسمان کی بلندی، کبھی خورشید کی تمازت، کبھی چاند کی اداسی تو کبھی سمندروں کے جوار بھاٹے ان کے دامن میں پناہ لیتے ہیں۔ ایک منظر کے بعد دوسرا منظر، پھر منظر کے بعد کا منظر، پھر پس منظر، گویا جسم کا یہ دروازہ ہر منظر کے لئے کھلا ہی رہتا ہے۔ میری آنکھوں نے کیا دیکھا، کیا سمجھا، کیا کھویا، کیا پایا، کسے اپنایا، کسے ٹھکرایا، کہاں بھٹکیں، کہاں ان کی سرزنش ہوئی، کس منظر کو یاد رکھا، کسے بھلا دیا، کس سے بات کی، کس سے منہ موڑا، کہاں اٹھیں، کہاں جھک گئیں، کہاں دل بن گئیں، کہاں ذہن میں ڈھل گئیں، کہاں ان پر پیار آیا، کہاں انھیں نوچ کر پھینکنے کو جی چاہا، ایک نہ ختم ہونے والا منظر نامہ ہے جو قلم کے راستے کاغذ کی روح میں اتر گیا ہے۔

آنکھیں بند کرتی ہوں تو اندر کی آنکھ پلکیں جھپکنے لگتی ہے۔ آنکھیں کھولتی ہوں تو خود آنکھ بن جاتی ہوں۔ لگتا ہے کائنات کی سب آنکھیں میرے وجود پر آ گئی ہوں۔ ہر زاویہ نگاہوں کی زد میں آ کر انکشاف کی نئی قیامتیں توڑتا رہتا ہے۔

باطن کی آنکھ کھل جائے تو ظاہری آنکھیں مضطرب ہو اٹھتی ہیں۔ چشمِ حیراں کو دلاسا دینا چاہا مگر تلاش وجستجو میں کوئی سرا ہاتھ نہ لگا۔ دل سے پوچھا تو وہ خود آنکھ بن گیا۔ ذہن سے سوال کیا تو کئی آنکھیں اس کے اندر روشن ہو گئیں۔ روح سے پوچھا تو اس کی تابنا کیوں نے نئے عالم آشکار کر دیئے۔

کچھ سمجھ میں نہیں آتا کیا دیکھ رہی ہوں، کیا آنکھ سے اوجھل ہے اور کیا اوجھل نہیں ہے۔ جو نظر آتا ہے وہ ہے نہیں ہے، سب دھوکا ہے، باطل ہے، فریبِ نظر ہے، جو ظاہر کی آنکھ نہیں دیکھ سکتی وہی سچ ہے، وہی حق ہے، وہی جستجو، وہی راستہ، وہی منزل ہے، وہی خواب ہے، وہی تعبیر ہے، اندھیرا فریب دیتا ہے، آنکھ اس فریب کو سمجھتی ہے۔ اندھیروں میں بھی متلاشی آنکھیں ظلمت کا پردہ چاک کر کے وہ دیکھ لیتی ہیں جو دیکھنا چاہتی ہیں۔ اندھیرا چشمِ بینا کی راہ میں دیوار نہیں بن سکتا۔

آنکھیں راستے کی ہر دیوار گرانا جانتی ہیں۔ بشرطیکہ ہنر مند ہوں لگن رکھتی ہوں، کیف ومستی سے سرشار ہوں، جذب کا ایسا عالم ہو کہ ہر چیز وجد میں آجائے۔ کائنات پاؤں میں گھنگرو پہن کر محوِ رقص ہو جائے، ڈھولک کہیں اور بجے، رقص کہیں اور ہو۔ یہ آنکھ کے عرفان کی انتہا ہے۔

پیدائش اگر ایک انتہا ہے تو موت دوسری انتہا۔ ہم خاکی صورت لوگ ان انتہاؤں کے درمیان قید ہیں، جتنے مجبور ہیں اتنے بااختیار بھی ہیں، جتنی لگن ہے، جتنی تڑپ ہے، اتنا ہی اختیار بھی ہمارے حصے میں آئے گا۔ پھر سب عیاں ہو جاتا ہے، آگہی کے در وا ہو جاتے ہیں، پردے اٹھتے ہیں، اصل تماشا نظر آتا ہے۔ بس جادۂ عرفاں پر چلنے کی ضرورت ہے۔ باطن کی آنکھ ایک کے بعد ایک منظر دیکھتی ہے تو ظاہر کی آنکھ حیرتوں میں ڈوب جاتی ہے۔

یہ کائنات حیرت کدہ ہے۔ صرف دیکھنے والی آنکھ چاہیے۔ حیرت زدہ آنکھوں نے جب اردگرد دیکھا تو سب اپنا ہی لگا۔ ہر آنکھ اپنی آنکھ اور ہر روشنی اپنی روشنی تھی۔ میری

آنکھیں، میری نہ رہیں۔کائنات میں بکھر کر ہر منظر کے چہرے پر ثبت ہوگئیں۔اس ادل بدل میں سب آنکھیں میری آنکھیں بن گئیں۔سب نقش میرے تھے، سب رنگ، سب جذب، سب کیف و مستی میرے اندر ہی موجود تھی۔رگوں میں دوڑتا ہوا لہو ثناء خوانی کر رہا تھا۔دل کسی کی یاد میں گریہ زاری کر رہا تھا۔ایک شور تھا جو کبھی سکوت میں ڈھل گیا تو کبھی شعروں میں اتر کر کاغذ کے وجود سے لپٹ گیا۔ملی جلی کیفیات کا یہی اظہار نظموں کی شکل میں قارئین کی نذر ہے۔

ڈاکٹر رضیہ اسماعیل
برمنگھم
۶ رستمبر ۲۰۰۱ء

راز و نیاز

فلک تیرا، زمیں تیری
ترے لوح و قلم، شمس و قمر اور آب و گل تیرے
ترے مجبور بندے ہیں
بدن کی قید میں محصور بندے ہیں
فریضہ سونپ کر ہم کو نیابت کا، امامت کا
بٹھا کر مسندِ شاہی پہ
پائے تخت تو نے توڑ ڈالے ہیں
یہ کیسا تخت ہے، یہ تاج کیسا ہے!
نہ جاری کر سکیں فرمان کوئی ہم
ہمارا بخت کیسا ہے

کیے امر و نہی کے فیصلے روزِ ازل سے جب
تو پھر تقدیر اور تدبیر کیوں دست و گریباں ہیں
کبھی اترو فلک کی چوٹیوں سے
دیکھنے بندوں کے روز و شب
کہ ہم پر کیا گزرتی ہے
زمیں کتنی پریشاں ہے
ترِے بندوں نے اس کو
نفرتوں کی آگ میں کیسے جلا ڈالا
اسی دوزخ میں ہم ہر آن جلتے ہیں
سنا ہے!
تو نے بھی انساں کے ایندھن سے
کوئی دوزخ بنایا ہے
ذرا اس آگ سے کہہ دو
بھڑ کنا چھوڑ کر آنکھوں کو کھولے...... غور سے دیکھے
ہمارے دل میں بھی اک آگ جلتی ہے
دُکھوں کی آگ جو دن رات جلتی ہے

اے میرے منصفِ اعلیٰ!
ترے مظلوم اور محکوم بندے
کس طرح آتش کے پھر صدمے اٹھائیں گے
ستم جو ہو چکے ہم پر انھیں کیسے بھلائیں گے
کہو! نارِ جہنم سے
بھڑکنا چھوڑ کر گلزار ہو جائے
ہماری مونس و غم خوار ہو جائے......!

سب مٹّی میں مِل جاتے ہیں

ہم خاکی صورت لوگ جہاں میں
کیا کیا ڈھونگ رچاتے ہیں
سب ڈھونگ یہیں رہ جاتے ہیں
ہم مٹی میں مل جاتے ہیں
یہ مٹی اوّل آخر ہے
یہ مٹی ظاہر باطن ہے
اس مٹی میں ہم تیرتے ہیں
اس مٹی میں بہہ جاتے ہیں
اس مٹی سے تم پیار کرو!
جاں سو سو بار نثار کرو!
کبھی مٹی سے بھی پوچھو تم
جب چکی پاٹ پسی تھی یہ
جب آوے پار اتاری گئی
بے چین سلگتی روحوں سے

جب اس کی گود سنواری گئی
نخوت سے روندی جائے جب
کیا اس کے دل پر بیتتی ہے
یہ منہ سے چاہے کچھ نہ کہے
پر ایک حقیقت جانتی ہے
جسے ساری دنیا مانتی ہے
ہم خاکی صورت لوگوں کو
آغوش میں اک دن لے لے گی
پھر راز و نیاز کرے گی یہ
بے نور ہوئی ان آنکھوں میں
تب سو سو اشک بھرے گی یہ
جب یہ ہی اندر باہر ہے
جب یہ ہی آگے پیچھے ہے
یہی اوپر ہے، یہی نیچے ہے
کس بات پہ تم اتراتے ہو!
مٹی ہو تو مٹی بن کے رہو
اے خاکی صورت لوگو تم...... !

ماں

کہا ہر دم زمیں کی گود کیوں بے چین رہتی ہے
جواب آیا کہ ماں اولاد کے دُکھ دل پہ سہتی ہے

کہا ممتا کے دم سے ہی زمانے میں اُجالا ہے
جواب آیا کہ یہ ہستی ہمارے دل میں رہتی ہے

کہا سوتے محبت کے کبھی سوکھے نہیں دیکھے
جواب آیا یہ وہ ندّی ہے جو ہر وقت بہتی ہے

کہا جب ماں بچھڑ جائے تو کس دنیا میں جاتی ہے
جواب آیا کبھی کرنوں ، کبھی تاروں میں رہتی ہے

کہا جذبات کی لہروں کو دل میں کس طرح دیکھوں
جواب آیا کہ ممتا ہر سمندر میں جو رہتی ہے

تحریر

لکھو ، اتنا لکھو

یہ زندگی تحریر بن جائے

کسی کاغذ کے ٹکڑے پر

کوئی بگڑی ہوئی تقدیر بن جائے!

لکھو ایسے کہ حرفوں سے

کسی ماہر مصوّر کی کوئی تصویر بن جائے!

ترے لفظوں میں وہ تاثیر ہو

جو پاؤں کی زنجیر بن جائے!

انڈیلو دل کا سارا درد

تم کاغذ کے ٹکڑوں پر

کوئی فقرہ قلم سے روٹھ کر کچھ اس طرح نکلے

کسی نادیدہ کل کی قیمتی جاگیر بن جائے!
اسی تحریر کے ناتے ہمارے ملنے کی
شاید کوئی تدبیر بن جائے!
کہا تھا تم نے یہ مجھ سے......!!
میں جب سے لکھ رہی ہوں
میں ہر اک حرف پر یہ سوچ کر نقطے لگاتی ہوں
کہ ان میں نقش ابھرے گا......تمھارا نقش!
جسے لفظوں کے پیچ وخم میں ہی میں قید کرلوں گی
مگر لفظوں کو سو سو بار لکھنے پر
کئی نقطے لگانے اور مٹانے پر
کوئی بھی عکس تو کاغذ کی بانہوں میں نہیں آتا
کہاں ہو تم...... کتابِ زندگی کے
کون سے پنے میں رہتے ہو!
ہمیں لفظوں کے گھر میں چھوڑ کر
تم نے کہاں پر گھر بنایا ہے!
کہاں دل کو لگایا ہے!

ہمیں کیسے بھلایا ہے!
نہیں آنا، نہیں ملنا
کوئی تحریر ہی بھیجو
کہ اک تحریر کا تحریر سے رشتہ تو ہوتا ہے......!

منظروں کی تلاش

چلو ان منظروں کو ڈھونڈتے ہیں
کھو گئے ہیں جو!
گلابوں سے لدی شاخوں
اور ان کے خارزاروں میں
کھِلا روشن گلاب اِک تھا
کہ جس کو توڑنے کی چاہ میں
ہاتھوں پہ میرے زخم آئے تھے
ترے ہاتھوں نے چھو کر
پیار کے مرہم لگائے تھے
درختوں کی زمیں کو چومتی شاخیں
پھلوں کے بوجھ سے دم توڑتی شاخیں

پرندے جن پہ آ کر
پیار کے نغمے سُناتے تھے
انہی پیڑوں کی چھاؤں میں
ہزاروں رنگ سپنوں کے
کنول نینوں سے ہوکر
پھیل جاتے تھے فضاؤں میں
نشہ ایسا نگاہوں میں
کہ طائر بھول کر سب بولیاں اپنی
ہمارے پیار کے منظر میں جیسے کھو سے جاتے تھے
تو بچھڑا ہے......تو تیرے بعد سب منظر پرائے ہیں
اداسی ہی اداسی ہے
گلوں کے رنگ پھیکے ہیں
پرندے ڈھونڈتے ہیں پیار کا پھر سے وہی منظر
مگر ہم کو نہ پا کر......
اوڑھ لیتے ہیں ردائے غم
وہی غم جو اترتا ہے

دلوں میں منظروں کے روٹھ جانے پر
وہ میرا غم......وہ تیرا غم......
ہمارا غم...... جسے کوئی نہیں محسوس کر سکتا......!

مصوّر

تمھارارات بھر......

یوں کروٹیں لینا، بتاؤ کس لئے ہے!

کبھی آنکھیں، کبھی تکیہ

کبھی بانہوں کا ہالہ سا بنا کر

آنکھ سے اوجھل

گئے وقتوں کے سپنوں سے گلے ملنا

کہو!

یادوں کے بستر پر کہاں تک کروٹیں لو گے!

مِرا ماضی بھی تم اور حال بھی تم ہو

تو پھر یہ کیسے اندیشوں نے دل میں سر اٹھایا ہے!

یہ سوچوں کا گھنا جنگل

تمھیں ماضی کی قیدِ بامشقت سے

کرے گا کس طرح آزاد

جب تک تم

گئے وقتوں کے پیڑوں کے تنوں سے

سر ٹکائے موند کر آنکھیں یونہی بیٹھے رہو گے

بھلا کس شخص کا ماضی نہیں ہوتا!

اسی ماضی سے ہی ہم حال کی تعمیر کرتے ہیں

کسی آنکھوں سے اوجھل

کل کے ہر لمحے میں

اک ماہر مصوّر کی طرح سے رنگ بھرتے ہیں

اگرچہ شوق میں جینے کے سو سو بار مرتے ہیں

مگر!

ہاتھوں سے ہم اپنے برش گرنے نہیں دیتے

کسے معلوم......

کس سوئے ہوئے بے رنگ لمحے میں

نہ جانے کس طرح کے رنگ بھر جائیں

انہی رنگوں سے منزل کا

کوئی دھندلا نشاں ہی ہاتھ آجائے......!

آغازِ نو

چلو آغاز کرتے ہیں
کسی انجام سے پہلے
سفر کو ختم کرتے ہیں
اترتی شام سے پہلے
کسی انجام کی وحشت کا سارا خوف
دریا بُرد کر ڈالیں
ازل سے ٹھوکریں کھاتے ہوئے
تنہا مسافر کے لئے تاریک رستے میں
کوئی شمع جلا ڈالیں
چلو مٹی کے پیالوں سے چھلکتی
مضطرب، بے چین روحوں کو
محبت، پیار اور امید کا نغمہ سنا ڈالیں

ہمیں انسان کی کھوئی ہوئی عظمت کے
جتنے بھی حوالے ہیں
سبھی کو ڈھونڈ نا ہوگا
ہمیں انسان کے قدموں سے باندھے سب بھنور
اک ایک کر کے کھولنے ہوں گے
ہمیں میزان کے پلڑوں میں
سچ اور جھوٹ کے سارے حوالے تولنے ہوں گے
کسی انجام سے پہلے اگر آغاز ہو جائے
تو پھر انجام کی وحشت کا سارا خوف
اپنے آپ مر جائے ......!

بدلتے موسم

کبھی میرا بسیرا تھا
ترے دل کے نہاں خانوں میں
آنکھیں موند کر میں
صحنِ دل میں رقص کرتی تھی
کبھی اٹھلاتی پھرتی ناز سے
موسم بدلتے دیکھتی تھی
آتے جاتے سارے موسم بے اثر تھے
اس لئے کہ صحنِ دل کا اپنا موسم تھا
میں دل کی آنکھ سے
ہر لمحہ تجھ کو دیکھتی رہتی
کہ تم ہی مرکز ومحور بنے میرے
مرے خوابوں، گلابوں

رتجگوں، قوسِ قزح

مانوس، نامانوس جذبوں کے

مگر جب لے کے انگڑائی اٹھی میں بسترِ دل سے

اندھیرا چار سُو تھا، گھور اندھیرا

لگا یوں روح جیسے

کر چکی پرواز جسمِ ناتواں سے

مِرے خوابوں، گلابوں

رتجگوں، قوسِ قزح کے

رنگ سارے کھو چکے تھے

مِرے اُس چاہنے والے کے

سب جذبے پرانے ہو چکے تھے

مگر یہ زندگی میری، مگر یہ دل تو میرا ہے

نئے جذبوں نئے رنگوں سے

اس کو پھر سجانا ہے

مجھے اُس نے بھلایا ہے

مجھے اُس کو بھلانا ہے

مکمل بھول جانا ہے
اگر موسم بدلتے ہیں
تو دل بھی ایک موسم ہے
اسے بھی لہلانا ہے
اسے بھی مسکرانا ہے......!

میں تم سے محبت کرتا ہوں

وہ دن ہے ابھی تک یاد مجھے
سو پیار بسا کر آنکھوں میں
جب تم نے کہا تھا ہولے سے
''میں تم سے محبت کرتا ہوں''
اِک وہ بھی دن پھر آیا تھا
جب سیج پہ میں دلھن بن کر
نظروں کو جھکائے بیٹھی تھی
مِرا ہاتھ پکڑ کر ہولے سے
یہ تم نے کہا تھا پھر مجھ سے
''میں تم سے محبت کرتا ہوں''
پھر آنگن پھولوں سے مہکا
خوشبوئیں بکھریں چاروں طرف

اک بار محبت سے تم نے

پھر مجھ سے کہا اے جانِ جہاں

''میں تم سے محبت کرتا ہوں''

پھر سارا منظر بدل گیا

دل دور ہوئے، رنجور ہوئے

آئینے محبت کے سارے

جتنے تھے چکنا چُور ہوئے

آواز مجھے اب آتی ہے

میں تم سے نفرت کرتا ہوں......!

سُکھ کا دُکھ

میں دُکھ کے راستے پر
چلتے چلتے تھک گئی ہوں اب
مِرے پاؤں کے چھالے
ہر گھڑی فریاد کرتے ہیں
کسی دُکھ میں چھپے
چھوٹے سے سُکھ کو یاد کرتے ہیں
مِرے اندر کی وہ سہمی ہوئی عورت
مقیّد جسم کے تاریک کمرے میں
پھٹی آنکھوں سے ہر لمحہ
کوئی کھڑکی، کوئی دروازہ
کھلنے کی صدا کی منتظر
اب تھک گئی ہے

کبھی تو سوچتی ہو گی
یہ کیسے جسم کو مسکن بنا ڈالا
انہی سوچوں میں غلطاں
چیختی ہے اتنی شدت سے
کہ اس تاریک سے گھر کے در و دیوار
ہر لمحہ لرزتے ہیں
خدا جانے وہ کیا کہتی ہے
مجھ کو کچھ سنائی ہی نہیں دیتا
مرے کانوں میں تو دن رات
دُکھ کے گھنگروؤں کی
تیز سی جھنکار آتی ہے
اسی جھنکار سے سر مست ہو کر
درد کی ہر تال پر میں رقص کرتی ہوں
کبھی اس کو ملے فرصت مجھے ایسے نچانے سے
مجھے پاگل بنانے سے تو پوچھوں گی
مجھے اس نے چُنا ہے کس لئے

اس رقص کی خاطر
دُکھوں کے جشن کی خاطر
مگر......
اس نے تو جیسے انگلیاں کانوں میں ٹھونسی ہیں
مِری آواز سے ڈرتا ہے یہ
نالے مِرے اس کا کلیجا چیر نہ ڈالیں
کہیں زخموں کی شدت سے
میں اس کو روند نہ ڈالوں
مٹا دوں اس کی ہستی کو
اسے برباد کر ڈالوں
مگر پھر سوچتی ہوں!
اگر دنیا سے دُکھ ناپید ہو جائے
تو سُکھ کا دُکھ
کہیں سب کو نہ لے ڈوبے......!

چاند کی دستک

چاند نے پھر......

مرے دروازے پہ دستک دی ہے

رات کے سینے پہ اِک چوٹ نئی پڑتی ہے

خامشی رات کی تاریکی سے پھر لڑتی ہے

مجھے اب چاند کی کرنوں سے بھلا کیا لینا

اب میں دروازہ نہیں کھولوں گی

چاند سے اب نہ کبھی بولوں گی

دل کا مہمان بنایا تھا اسے پہلے بھی

اپنی کرنوں کو سمیٹے اک دن ایسا روپوش ہوا

ایک جھلک دیکھنے کو

مدتوں میں اسی دروازے کو تکتے تکتے
کتنی ویران ہوئی، کتنی پشیمان ہوئی
میں تو اب من میں ہی اک دیپ جلا بیٹھی ہوں
سانحہ گزرا تھا جو اس کو بھلا بیٹھی ہوں
چاند تو چاند ہے ہر بام سے جھانکے گا ضرور
آج تو کرنیں بھی آئی ہیں سفارش لے کر
چاند کے سینے کے داغوں کو ذرا دیکھو تم
یہ سیاہ داغ جدائی کے اسے کس نے دیئے!
یہ بھی افسردہ ہے، غمگین ہے، بے چارہ ہے
لاکھ ہرجائی بنے، چاند تو پھر چاند ہی ہے
اپنی کرنوں سے اندھیروں کی ردا چیر کے پھر
ترے آنگن میں وہ اترے گا اُجالے لے کر
چاند تو چاند ہے......
اب اس سے بگڑنا کیسا!

فقط اتنا ہی برسو

سمے کی بارشیں......
دن رات آنگن کو بھگوتی ہیں
مِرے احساس کے نازک سے پودے
بھیگ کر اس غم کی بارش میں
سجا کے اشک پلکوں پر
بہت ہی بے بسی سے
مجھ کو تکتے ہیں
کہ جیسے بارشیں غم کی میرے کہنے پہ برسی ہوں
یہ بارش جب بھی آتی ہے
تو بندھن ضبط کے سب ٹوٹ جاتے ہیں
میں اس میں ڈوب جاتی ہوں

مِرے آنگن کا وہ سرمست بیلا
جو کبھی سرگوشیاں کرتا تھا اور ہنستا ہنساتا تھا
مِری حالت پہ اب آنسو بہاتا ہے
غموں کی بارشوں نے راستہ سورج کا روکا ہے
مِرے چاروں طرف تاریکیوں کا ایک صحرا ہے
مِری خوشیوں پہ جیسے غم کا پہرا ہے
یہ بارش جب بھی آتی ہے
مِرے مُردہ دُکھوں کو اس طرح سیراب کرتی ہے
کہ یہ پھر سے جنم لے کر
مِری آغوش میں سر رکھ کے
اک معصوم بچے کی طرح سے
دیکھتے ہیں مجھ کو ہر لمحہ
یہ منظر کس قدر تکلیف دیتا ہے
تمھیں کیسے بتاؤں میں!
کبھی آ کر سمے کی بارشوں سے بس یہی کہہ دو
فقط اتنا ہی برسیں جس قدر ان کی ضرورت ہے......!

ڈائری

چند خالی ورق ڈائری کے
مدتوں سے مرے منتظر ہیں
ہار لفظوں کے ان پر پروتی تھی میں
یہ فسانے ہیں جب ساتھ رہتے تھے تم
تیری یادوں کی زنجیر ٹوٹی جہاں
لفظ روٹھے قلم سے مرے اس طرح
اب سیاہی کے ہونٹوں پہ خشکی جمی
نرم و نازک قلم کا سراپا نما
مجھ کو لگتا ہے کوہِ گراں کی طرح
دل کی نازک رگوں کی یہ تنہائیاں
میرے لفظوں میں بھی
اب بھی اتر آئی ہیں

پرنسس ڈایانا کی موت پر

دل گرفتار ہیں کچھ ایسے فسوں میں ترے
سب کو ہر سمت شبیہ تیری دکھائی دے گی

تو نے جو درد کا رشتہ ہے بنایا سب سے
ساتھ اب تیرا یہی نیک کمائی دے گی

پیار کی جوت جو ہر دل میں جلائی تو نے
ظلمتِ شب میں وہ اِک دیپ دکھائی دے گی

تو نے ہر شخص کو یوں ٹوٹ کے چاہا ہے کہ اب
ساری دنیا میں محبت ہی دکھائی دے گی

تیرے جذبوں کا ہے اعجاز کہ اب عالم میں
مر کے بھی گونج سدا تیری سنائی دے گی

دریدہ بادباں

ہوا پھولوں سے جب اٹھکیلیاں کرتی ہے
دل میں ہوک اٹھتی ہے
ہوا ہرجائی ہے کہتی ہوں پھولوں سے
تمھیں برباد کردے گی
تمھارے رنگ کچھ ایسے چرائے گی
کہ خود تم کو خبر ہونے نہ پائے گی
انہی رنگوں کو لے کر اک نئی بستی میں جائے گی
کسی چہرے، کسی منظر میں
پھر سے رنگ بھر دے گی
تمھاری زندگی لے کر
کسی کو زندہ کردے گی

ہوا کی سازشوں کو جانتے ہیں یہ
مگر شکوہ نہیں کرتے
اگر شکوہ کریں گے بھی تو اس پر کیا اثر ہوگا
بہت رنجیدہ ہو کر یہ ہوا
اک دن مِرے آنگن میں آئی تھی
میں سمجھی غم زدہ ہے
حالِ دل اپنا سنائے گی
مگر کیسے بتاؤں!
اس ہوا نے کس طرح کا وار کر ڈالا
کہ یہ تو لے اُڑی تقدیر ہی میری
سفینے سب الٹ ڈالے
دریدہ بادباں......
تقدیر کے بے جان سے تن سے لپٹ کر
روز و شب فریاد کرتے ہیں
نہ جانے کس لئے
ظالم ہوا کو یاد کرتے ہیں......!

خزاں کی زد میں

کہو پھولو......

نزاکت، بانکپن، شوخی، شرارت اور رنگوں کا
کبھی نہ ختم ہو جو سلسلہ تم کو ملا کیسے!
کہا دنیا میں کتنے لوگ افسردہ
پریشاں حال رہتے ہیں
کبھی امروز کا غم ہے
کبھی فردا کے خدشے ہیں
نگہ ان کی فقط اندر کے موسم دیکھتی ہے
جب کہ یہ موسم خزاں کی زد میں رہتے ہیں
انہی کے واسطے......
فطرت نے سارے رنگ بھیجے ہیں

ہمیں معلوم ہے تم بھی انہی لوگوں میں شامل ہو
تمھیں شاید خبر نہ ہو
مگر رشتہ ہمارا تم سے گہرا ہے
بہت غمگین لمحوں میں
محبت کا سندیسہ لے کے
ہم مرقد پہ آتے ہیں
نزاکت، بانکپن، شوخی، شرارت
جو ہمیں بخشی گئی ہے
وہ تمھارا بھی اثاثہ ہے
مگر غم کی ہوائیں تم کو ہر لمحہ جُھلستی ہیں
تمھارے واسطے ہی ہم نے یہ گلشن سجایا ہے
کسے معلوم......
یہ چاروں طرف پھیلی ہوئی خوشبو
خوشی کا کون سا لمحہ کسی ہاتھوں میں دے جائے
غموں کا سائباں مہکی ہوائیں لے اُڑیں
اور بادلوں کے پار لے جائیں......

یادیں

بیتے دنوں کی رِم جھم
دل پر برس رہی ہے
احساس کی ضیاء کو
یہ تیز کر رہی ہے
تیری رفاقتوں کے
بیتے ہوئے زمانے
ہیں دسترس سے باہر
یہ جانتے ہوئے بھی
سو خواہشوں نے دل میں
پھر سر اٹھا لیا ہے......!

جیون سپنے

میرے آوارہ جیون سپنے
بے چین پرندے کی مانند
کبھی جنگل میں، کبھی بستی میں
تری دید کی آس سجائے ہوئے
کبھی برکھا سنگ، کبھی بادل سنگ
اُڑتے ہیں تو اُڑتے رہتے ہیں
میرے آوارہ جیون سپنے......!

پھر پوچھیں گے......

گفتار کو ہونٹوں سے
رفتار کو پاؤں سے
آندھی کو بلاؤں سے
سورج کو ضیاؤں سے
بادل کو گھٹاؤں سے
خوشبو کو ہواؤں سے
ہونٹوں کو دعاؤں سے
تم کر کے جدا دیکھو......!
پھر پوچھیں گے ہم تم سے
کیا حال تمھارا ہے......!

اُجڑے شجر

اُجڑے پیڑوں سے گلے مل کے خزاں روتی ہے
داغ جو اُن کو دیئے
اب یہ وہی دھوتی ہے
ننگی شاخیں ہیں کہ محروم مسیحا
کوئی رِستا ہوا زخم
سُن کے شاخوں کی شکایت کو
پرندوں نے ٹھکانے ہی بدل ڈالے ہیں
اب تھکے ماندے مسافر ہیں
نہ سرگوشیاں ہیں
نہ محبت کے پجاری
نہ تنوں پر کوئی نام
ایسی دُزدیدہ رُتوں میں تو شجر یاد کیا کرتے ہیں

ان کو جو کھود گئے نام تنوں پر ان کے
بن کے غم خوار خزاں کس لئے اب آئی ہے!
میں کہاں تک......
یہ عجب وصل کا منظر دیکھوں
اُجڑے پیڑوں کے لئے
حرفِ تسلی بھی میرے پاس نہیں
کبھی بدلے گی خزاں اپنا چلن
اس کی مجھے آس نہیں!

بیٹی

اِک ناتواں وجود سے......

تو نے جنم لیا

بھیجا سلام رحمتِ پروردگار نے

تکمیل اِک وجود کی

کردی ہے تو نے آج

کیسا یہ نور چھایا ہے ماں کے وجود پر

لیکن......

رحمت کی اِس گھڑی میں

خوشیوں کی اِس جھڑی میں

کچھ چہرے ہیں فسردہ

جذبے ملے جُلے سے

آوازیں رنگ برنگی
کانوں میں آ رہی ہیں......
رحمت خدا کی آئی......
برکت ہے گھر میں آئی......
اترے ملک زمیں پر......
چھاؤں کریں پروں کی......
بیٹی نہیں فقط یہ......
جنت کا راستہ ہے......
اتنے میں......
آواز اک لرزتی
پیرانہ سال آئی
سب ٹھیک ہے مگر یہ
بیٹی ہی ہے ناں آخر......!

تِرا نام بھی پیارا ہے

ساحل ہے، سمندر ہے
جوبن پہ ہوائیں ہیں
آکاش کے سارے رنگ
پانی میں اتر آئے
ایسے میں کمی تیری محسوس جو ہوتی ہے
اس ریت کو تکتی ہوں
قدموں کے نشاں تیرے
شاید ہوں کہیں اب تک
اب پاس نہیں ہو تم
بس یاد تمھاری ہے
جیسے ریت پہ ساحل کی
لکھا ہے محبت سے

کچھ سوچ کے پھر اس کو
ہاتھوں سے مٹا ڈالا
دیوانہ کہیں کوئی
نہ روندا سے ڈالے
ہمیں تیری طرح اے دوست
ترا نام بھی پیارا ہے

کہو مجھ سے......

تمھارے دل میں جو کچھ ہے
کہو مجھ سے، سنو مجھ سے
تمھاری گہری خاموشی
مجھے زہریلے سانپوں کی طرح سو بار ڈستی ہے
کہو یہ زہر ہر لمحہ
ملائم سے بدن پر روح کے
تم کس لئے ٹپکاتے رہتے ہو!
بتاؤ! سب کسی سے کہہ چکے ہو
یا......
ابھی کچھ اور کہنا ہے!
جو باتیں رہ گئیں دل میں
جو گھاتیں رہ گئیں من میں

وہ ساری بول بیٹھے ہو

یا......

کہنے کو ابھی کچھ ہے
کہو! کچھ تو کہو!

خوابوں میں، نیندوں میں
کھلی آنکھوں سے کیسے سپنے بُنتے ہو
تمھارے خواب کے آنگن میں
میرا بھی گزر ہوتا ہے

یا......

یہ خواب بھی تم کر چکے ہو
کسی اَن دیکھی انجانی سی ہستی کی نذر

بولو!
اگر یہ سب نہیں ہے تو
یہ خاموشی کا پیلا آسماں کیوں تم پہ چھایا ہے
کہیں یہ تو نہیں تم
مجھ کو بھی اک خواب سمجھے ہو

کھلی آنکھوں سے جو دِکھتا نہیں

اور بند آنکھوں سے......

تو پھر کچھ بھی نہیں دِکھتا

کہو مجھ سے!

سنو مجھ سے......!

سیج

پیار کی سیج پر......
دو بدن
کتنے ارماں سجا کر ملے
وہ یہ سمجھا کہ عورت کو سر کر لیا
کتنا نادان ہے......
کتنا انجان ہے......!

دردِ دل

دل کبھی درد کے صحرا سے نکلتا ہی نہیں
ختم ہوتی ہی نہیں آبلہ پائی اس کی
کتنے صحراؤں میں گھر اس نے بنا رکھا ہے
اور اِک اپنا نشیمن ہے کہ بستا ہی نہیں
بس بھی جائے جو یہ گھر اپنا تو پھر کیا ہوگا
کوئی جھونکا ہی ہوا کا اسے لرزا دے گا
جس کی بنیاد ہی بے چینی ہو
بے یقینی کی ہر اک خشت لگی ہو جس میں
ایسی بنیاد پہ کیا کوئی عمارت ٹھہرے......!

ساون

اب کے برس......
ساون میں جھولے کیسے ڈالوں گی
اب کے برس......
میں کوئلیا کو کیسے ٹالوں گی
بارش کی رِم جھم کو
دل میں کیسے اتاروں گی
بھیگے بدن کی خوشبو سے کس من کو سنواروں گی
ناز سے اُڑتی مست ہوا کے سنگ اُڑوں گی کیسے
جا رے بادل!
جا ری برکھا!
اور کوئی گھر دیکھو اب

جانتی ہوں
جو بچھڑ گئے ہیں
ساون سنگ نہ آئیں گے
ہم گیت اکیلے گائیں گے
آس کے پنچھی بھیگ گئے ہیں
اُڑ کے کہاں اب جائیں گے
اب گیت مِرے سنگ گائیں گے
سُن رے بادل!
سُن ری برکھا!
اب کے برس تو ساون میرے اندر آیا ہے
اندر کی برکھا نے اتنا شور مچایا ہے
باہر کے موسم تو اب خاموش سے لگتے ہیں
کچھ مدہوش سے لگتے ہیں

آواز

چلو آؤ......

چلیں، ہم تم کسی آواز کے پیچھے

کوئی آواز جو ہم کو صدا دے کر بلاتی ہو

کوئی نوحہ، کوئی دھڑکن، کوئی نغمہ سناتی ہو

وہ نغمہ جو کسی خاموش لمحے میں

کسی ٹوٹے ہوئے دل کے لئے

مرہم سا بنتا ہو

چلو آؤ......

چلیں، ہم تم کسی آواز کے پیچھے

جو آنگن میں اترتی شام میں

ممتا بھری لوری سناتی ہو

چلو آؤ......

چلیں، ہم تم کسی آواز کے پیچھے
مسرت، شادمانی کے کسی انمول لمحے میں
ہزاروں دیپ جلتے ہوں
بہت سے خواب پلتے ہوں
کئی ارماں مچلتے ہوں
جہاں مدھوشیوں کا راج ہو
سانسوں میں عنبر کا بسیرا ہو
نظر میں پھول کھلتے ہوں
جہاں چہرے گلابی ہوں
جہاں آنکھیں شرابی ہوں
جہاں کانٹے گلابوں سے گلے مل کر
انھیں حیران کرتے ہوں......!

خوشبو سے کیا کہوں گی

خوشبو ترے وصال کی
اب تک فضا میں ہے
یادوں کا ایک پنچھی اب تک ہوا میں ہے
تم نے کہا تھا پیار کی خوشبو کی منزلیں
دل سے گزر کے جسم کے خالی مکاں میں ہیں
خوشبو سے بھر گیا ہے یہ اُجڑا ہوا نگر
اس گھر کی پور پور میں خوشبو رچی ہے یوں
جیسے گلاب اس کی فصیلوں میں ہوں اُگے
خوشبو ترے وصال کی دم توڑنے کو ہے
خوشبو کے انتظار میں رہتا ہے ہر کوئی
خوشبو کو انتظار کا کوئی ہنر نہیں

روکے گا کون جاتی خوشبو کا راستہ

اے کاش!

کوئی آ کر اتنا مجھے بتا دے

اس گھر سے جانے والی

خوشبو سے کیا کہوں گی......!

یاد کے جگنو

تمھاری یاد کے جگنو چمکتے ہیں
مِرے چاروں طرف منڈلا رہے ہیں یوں
محبت کے شبستانوں میں جیسے ادھ کھلی کلیاں
معطر سے گلوں کے بازوؤں میں باہیں ڈالے
ناز سے اٹھلاتی پھرتی ہوں......!

کارواں جاچکا

توڑدے ، توڑدے
میرادل توڑدے
آرزو کا نگر، خواہشوں کا سفر
چھوڑدے، چھوڑدے
خواہشوں کے پرندے
منڈیروں سے میں نے اُڑائے تو ہیں
مانتے ہی نہیں، مانتے ہی نہیں
کیسے جانا ہے ان کوئی منزلوں کی طرف
جانتے ہی نہیں، جانتے ہی نہیں
پاؤں میں آس کی بیڑیاں ڈال کر
مجھ کو گھیرے میں لے کر

عجب رقص کرتے ہیں یہ رات دن

چھوڑتے ہی نہیں، چھوڑتے ہی نہیں

کہہ چکی ہوں میں ان سے

کہ اب جام خواہش کے تم توڑ دو

توڑتے ہی نہیں، توڑتے ہی نہیں

رات دن تم نے ماتم بپا جو کیا ہے

اسے چھوڑ دو

چھوڑتے ہی نہیں، چھوڑتے ہی نہیں

اپنی پرواز کے اب تو رخ موڑ دو

موڑتے ہی نہیں، موڑتے ہی نہیں

اب اگر آ سکو تو تمھی ان کو آ کے بتاؤ

کہ اب کارواں جا چکا

خواہشوں کے سفر پر

نئی خواہشوں کے سفر پر......!

تجھے دنیا میں رہنا ہے

محبت بال کھولے، سوختہ جاں، لڑکھڑاتی

ایک دن در پر مرے آئی

کہا!

کم ظرف لوگوں نے مجھے بدنام کر ڈالا

میں کتنی اجلی تھی، مجھ کو صبح سے شام کر ڈالا

کبھی آکاش ہوتی تھی

مجھے مٹی بنا ڈالا

میں اب فریاد کرتی ہوں

اسی کو یاد کرتی ہوں

کہا تھا جس نے مجھ سے

جاؤ سب کے من میں بس جاؤ
میں کس گھر میں بسوں!
جب کہ در و دیوار پر نفرت کے پہرے ہیں
زمانے کے لئے اب بس محبت لفظ ہے
اک نام ہے، وہ جام ہے
جس سے بجھا کر پیاس
اس کو توڑ دیتے ہیں
دلوں کو موڑ لیتے ہیں
اسی دُکھ کو سمیٹے میں
کبھی بادل میں ڈھلتی ہوں
کبھی برسات ہوتی ہوں
کبھی میں دُور ہوتی ہوں
کبھی میں پاس ہوتی ہوں
کبھی میں تیر بنتی ہوں
کبھی تلوار ہوتی ہوں
کبھی زخموں کا مرہم ہوں

کبھی نشتر چبھوتی ہوں
کہیں آنکھوں کا پانی ہوں
کہیں میں آگ ہوتی ہوں
کہیں میں آہ بن کر
آشیانے پھونک دیتی ہوں
کہا میں نے محبت تو بہت نازک
بہت پاکیزہ جذبہ ہے
یہ اتنی تلخیاں لے کر بہت سے دُکھ سمیٹے
کیسے اب خالق سے تو نظریں ملائے گی!
ترا مذہب نہیں نفرت
زمانہ تجھ سے کتنا تلخ ہو جائے
تجھے نفرت کے گھر میں قید کر ڈالے
تمھاری نوچ لے آنکھیں
تمھیں برباد کر ڈالے
ترے تن پر، ترے من پر
ہزاروں زخم آ جائیں

تو چاہے کتنی گھائل ہو
تجھے دنیا میں رہنا ہے
سبھی کا درد سہنا ہے
یہی تقدیر ہے تیری
یہی حکمِ الٰہی ہے!

آسماں تکتا ہے

آسماں تکتا ہے مجھ کو رات دن
سینکڑوں قاتل نگاہیں گھورتی ہیں صبح و شام
زیرِ سایہ آسماں کے سر جھکائے ہوں کھڑی
جیسے ملزم منتظر ہو جرم کی تعزیر کا
ہر گواہی ہو چکی، اب فیصلہ ہونے کو ہے
پوچھتی ہوں جرم میں نے کیا کیا؟
تو بتا چرخِ کہن! تو کب مِرا ساتھی رہا
بجلیاں، طوفان، آندھی ہی تِری اولاد ہیں
کیوں مِری نظروں کی رہ میں تو بنا دیوار ہے
ایک دن میری طرح تو ٹوٹ کر گر جائے گا
ریزہ ریزہ ہو کے بکھرے گا کچھ اس انداز سے

راز افشا ہوں گے سب
سارے بھرم کھل جائیں گے
چھوڑ دے تکنا مجھے تو چھوڑ دے
آسماں ہے تو اگر
دھرتی ہوں میں......!

ہمزاد

سنا ہے تم بہت مغموم رہتی ہو
کسی سے کچھ نہیں کہتی
ستم حالات کے چپ چاپ سہتی ہو
غموں سے اس طرح کی دوستی اچھی نہیں ہوتی
یہ سچ ہے غم خوشی دونوں ہی جیون کے پکھیرو ہیں
مگراب غم کے پنچھی کو......
اسی منڈیر پر بیٹھے ہوئے
کتنے زمانے ہو چکے
تم اسے دانہ کھلاؤ گی، اسے پانی پلاؤ گی
تو کیوں یہ اُڑ کے جائے گا کسی بھی دوسری چھت پر
غموں کا بوجھ سہنے کو تمھاری چھت سلامت ہے
سبھی صدمے اٹھانے کو تمھارا دل سلامت ہے
تمھاری سرمگیں آنکھیں غموں کو اس طرح پانی پلاتی ہیں

کہ تم خود تشنہ رہ کر بھی انھیں سیراب کرتی ہو
یہ کیا حالت بنائی ہے
نکل آ! غم کی وادی سے
تمھاری زندگی غم کے علاوہ اور بھی کچھ ہے
خوشی اک عارضی شے ہے
سدا تو غم ہی رہتے ہیں
جنھیں سب ہنس کے سہتے ہیں......!

لکیریں

لکیریں ہاتھ کی گر بول سکتیں تو......

بہت طوفاں اٹھا دیتیں

مِرے بازو پکڑ لیتیں، مِرے پاؤں جکڑ لیتیں

جو چکّی کی طرح دن رات چلتے ہیں

میں ہر لمحہ سفر کرتی ہوں، خوابوں میں، خیالوں میں

سفر کی حد تو ہوتی ہے، کوئی سرحد تو ہوتی ہے

کہیں رکتے تو ہیں پاؤں

مگر خوابوں خیالوں کی کوئی بھی حد نہیں ہوتی

کوئی سرحد نہیں ہوتی

جو نکلا اس سفر پر وہ کبھی واپس نہیں آیا

لکیریں گھورتی ہیں مجھ کو شعلہ بار نظروں سے

کہ میں ان کی حدوں کو توڑ کر آزاد کیسے ہوں

بہت حیران ہوتی ہیں
کہ جس قیدی کو ہم نے ہاتھ کے زنداں میں ڈالا تھا
قفس کو توڑ کر اس نے ہنر پرواز کا
سیکھا کہاں سے ہے
عجب قیدی ہے
جس کا جسم تو زنداں میں ہوتا ہے
مگر سوچوں کے در
اس آن سے، اس شان سے
کھل کر اسے آزاد کرتے ہیں
کہ یہ گونگی لکیریں
اور ہی کچھ قید ہو جاتی ہیں
ہاتھوں میں......!

لمحوں کا کھیل

وہ لمحہ کیسا تھا......

جب ہم نے ترا دیدار کیا

انکار کیا......اقرار کیا

پھر نظروں کے اس سنگم نے

روحوں کے دریچے کھولے تھے

یہ لمحے کتنے ظالم ہیں

یہ لمحے جب بھی وار کریں

بت اپنی اناؤں کے سارے

گر جاتے ہیں اِک اِک کر کے

جو لمحہ تیرے فسوں کا تھا

وہ لمحہ میرے جنوں کا تھا

دو لمحے مقابل جب آئے
تو صدیاں گزریں لمحوں میں
اِک وہ لمحہ، اِک یہ لمحہ
اور بیچ میں سب گورکھ دھندا
وہ لمحہ کیسا لمحہ تھا......!

آنکھ شرمندہ ہے

رات آنکھوں میں ستارے بھر کر
میری دہلیز پہ پھر آئی ہے
رات آتی ہے زمانے کے لئے
سُکھ کا سندیسہ لے کر
کچھ گرفتارِ بلا ایسے ہیں جن کی خاطر
رات اور دن کے تماشے میں کوئی فرق نہیں
دن کے ہر لمحے میں وہ رات کا غم کرتے ہیں
رات آتی ہے تو پھر دن کی دعا کرتے ہیں
نیند آنکھوں سے بہت دُور کسی وادی میں
خود تو سو جاتی ہے
اور مجھ کو جگاتی شب بھر

رات کو نیند کی خیرات بھلا کیسے دوں!

اسے دینے کے لئے کچھ بھی مِرے پاس نہیں

چشمِ حیراں کو کسی نیند کی اب آس نہیں

خواب آنکھوں میں ہی دم توڑ رہے ہیں اب تو

ہر صبح ٹوٹے ہوئے خوابوں کو چنتے چنتے

ہاتھ زخمی ہیں مِرے، آنکھ بھی شرمندہ ہے

اے سیہ رات!

مِرے گھر میں نہ تم آیا کرو

اس طرح روز مجھے آ کے ستایا نہ کرو!

کشکول

(ایک گداگر بچے کو دیکھ کر)

چاند کشکول لیے
دھوپ سے بدحال ہوئے
وقت کے اک رستے پر
اپنی کرنوں سے زمیں کے تن پر
اس طرح الجھا ہوا تھا
جیسے ڈھلتا ہوا دن
مل کے گلے شام سے ہوا افسردہ
تن لاغر تھا یا وہ مہرِ دو نیم
کس کو فرصت تھی کہ رک جاتا کوئی پل دو پل
پوچھتا چاند سے اے ماہِ منیر!

تیرے ہاتھوں میں یہ کشکول دیا ہے کس نے!
کوئی صدقہ، کوئی خیرات، کوئی بھیک ہی دو
دور سے آتی ہوئی اس کی صدا
بھوک کو سہنے کی اب تاب نہیں ہے مجھ میں
چاند کو دیکھ کے
میں سوچ رہی ہوں تب سے
کس نے اس چاند کی تذلیل کی سازش کی ہے
کس نے کرنوں سے مشقت کا ہنر چھین لیا
کس نے اس چاند کی تقدیر میں آنسو لکھے
ہاتھ کیوں کاٹ دیئے جن کی جواں ہمت نے
وقت کے دھاروں کے رُخ موڑنے تھے
کتنے طوفانوں کے منہ موڑنے تھے
چاند کو جب بھی میں کشکول لیے دیکھتی ہوں
میری آنکھوں میں ستارے سے اتر آتے ہیں

قیدِ تنہائی

کھول دو، کھول دو
سوچ کے بادباں کھول دو
سر اٹھا کے بہت ناز سے جانے والی ہوا نے کہا
سن کے پیغام یہ سوچ بھی سوچ میں پڑ گئی
میں تو صدیوں سے زندان خانوں میں ہوں
لب سلے ہیں مِرے، ہاتھ جکڑے ہوئے
پاؤں میں بیڑیاں
نرم و نازک سراپا ہے اک آبلہ
سلسلہ ظلم کا ہے کہ رکتا نہیں
میں نصیبوں جلی، جب سے پیدا ہوئی
قیدِ تنہائی ہے
ذرّہ ذرّہ یہاں پر تماشائی ہے

اک تعفن رچا ہے فضا میں یہاں
سانس لینا بھی اب مجھ کو دشوار ہے
اس قدر جاں گسل ہے مِری داستاں
کون یوسف کی چارہ گری اب کرے
کون یعقوب کی چشمِ بے نور میں، نور پھر سے بھرے
کوئی بھیجو مسیحا اے بادِ صبا!
تو ہوا ہے، جہاں میں ترا راج ہے
تُو تو آزاد ہے
بیڑیاں پاؤں میں تیرے پڑتی نہیں
اس جہاں میں سبھی تیرے محتاج ہیں
مجھ سے سارا زمانہ ہی ناراض ہے
سوچ کے بادباں، اس ہوا، اس فضا میں
کھلیں بھی تو کیسے کھلیں
مجھ کو تُو ہی بتا، مجھ کو تُو ہی بتا!

ہوا کے سنگ سنگ

خوشبوئیں ہیں
تتلیاں ہیں
اور......
کلیوں کی مہک
اُڑ رہی ہیں
کھل رہی ہیں
مہکتی ہیں چار سو
آشنا ہیں سب
ہوا کی مخملیں آغوش سے
بھینچ کر ان کو لگاتی ہے
گلے سے جب ہوا

مشک و عنبر، عود
رنگ و نور کے سب سلسلے
پھیل جاتے ہیں فضا میں
اس ہوا کے سنگ سنگ......!

تم اندھے ہو

عشق نے ایک دن حسن کی بارگہ میں
بہت عجز سے سر جھکا کر کہا
تو حسیں ہے، سنا ہے بہت ہی حسیں
کورچشمی مِری رہ میں دیوار ہے
دیکھ سکتا نہیں، تیری رعنائیاں
تیری خوشبو ہی میری عبادت رہی
تجھ کو پانا ہی میری ریاضت رہی
عشق کی بات پر حسن برہم ہوا
عشق سے اس نے کچھ یوں تکلّم کیا
غم کی وادی ٹھکانا ترا مستقل
درد کھاتے ہو تم، اشک پیتے ہو تم
خود تو جلتے ہو، سب کو جلاتے ہو تم

رات دن کا پتا تم کو چلتا نہیں
نیند میں بھی سرہانے مِرے بیٹھ کر
لوریاں مجھ کو غم کی سناتے ہو تم
حسن ہوں، زندگی سے مجھے پیار ہے
عشق کو جب بھی دیکھو وہ بے زار ہے
تم تو اندھے ہو! تم دیکھ سکتے نہیں
حسن کی بات سے عشق گھائل ہوا
ڈال کر خاک سر پر قبا چاک کی
حسن سے آخری اک ملاقات کی
خود سے وعدہ کیا
حسن کو اب رکھے گا سدا مضطرب
اس کے حصے میں ایسی تڑپ آئے گی
بجلیاں منہ چھپا کر چلی جائیں گی
حسن کی بے کفن لاش چلاّئے گی
چشمِ آہو اگر حسن کے پاس ہے
چشمِ بینا تو بس عشق کے پاس ہے......!

سب آنکھیں میری آنکھیں ہیں

سب آنکھیں میری آنکھیں ہیں
سب سپنے میرے سپنے ہیں
ان ٹوٹتے سپنوں میں بہتے
سب آنسو میرے آنسو ہیں
سب کالی راتیں میری ہیں
راتوں کے اندھیروں سے ڈر کر
سب ٹوٹتے تارے میرے ہیں
سورج میں جتنی آگ بھری
وہ سارے شعلے میرے ہیں

جو باتیں رک گئیں ہونٹوں پر
وہ سب افسانے میرے ہیں
گلشن میں جتنی بہاریں ہیں
ان سب کی خزائیں میری ہیں
سب موسم میرے موسم ہیں
کیوں پھر بھی ہوں تنہا تنہا......!

یاد

(ایک نظم ثناء کے لئے)

مجھے تم یاد آتی ہو
بہت ہی یاد آتی ہو
کوئی موسم بھی اب
دل کو مرے اچھا نہیں لگتا
تمھاری یاد کے موسم کے پتّے زرد ہو کر
دل کے آنگن میں تمھیں ہی یاد کرتے ہیں
وہی کمرہ......
وہی بستر ......
وہی گڑیا......

وہی بھالو......

درودیوار اس گھر کے تمھیں ہی یاد کرتے ہیں

وہی باتیں......

وہی شوخی شرارت سے بھری آنکھیں

اچانک آ کے آنکھوں پر تمھارا ہاتھ رکھ دینا

بہت ہی پیار سے گالوں پہ بوسہ لے کے

سر کو گود میں رکھنا

محبت کے ستاروں کا خوشی سے رقص کرنا

اور تمھارا جھوم کر

پلکیں جھپک کر پیار سے کہنا

مِری ماں! تم مِری ماں ہی نہیں، میری سہیلی ہو

تمھارے بن اکیلی رہ نہ پاؤں گی

مجھے تم چھوڑ نہ جانا

کہیں منہ موڑ نہ جانا

مِری جاں!

اب کہاں ہو تم

وہی ماں اب

اسی بھالو.....

اسی گڑیا.....

اسی بستر.....

اسی مانوس کمرے میں

بہت غمگین بیٹھی ہے

کہاں ہو تم

چلی آؤ!

مجھے تم یاد آتی ہو

بہت ہی یاد آتی ہو......!

نشاطِ غم

اگر تم لوٹ بھی آئے
تو ایسے میں کوئی سپنا
نگاہوں کی بہت ویران سی اُجڑی ہوئی
اس رہگزر سے کس طرح قدموں پہ چل کے
آس کے مندر میں جائے گا
پجارن تھال میں پوجا کے دیپ اور پھول لے کر
کون سی چوکھٹ پہ جائے گی!
کہاں ایسا ملے گا دیوتا اس کو
کہ جس کہ چرنوں میں
مرجھائے پھولوں کو چڑھائے گی
اگر اب لوٹ آئے تم
تو میں تاریک اور خاموش راتوں سے
نظر کیسے ملاؤں گی

یہ راتیں راز داں میری

خموشی میں زباں میری

مِری تنہائی کی ساتھی بہت شکوہ کناں ہوں گی

تمھارے ساتھ رہ کر بھی بہت تنہا رہوں گی میں

وفا تم سے کروں گی تو مِری تنہائی

مجھ کو بے وفا ٹھہرائے گی

وہ روٹھ جائے گی

تمھارا تو بھروسا ہی نہیں ہے

ایسے میں ساتھی مِری

آنکھوں میں اشکوں کے سمندر لے کے

بولو! کون سے ساحل پہ جائے گی

بہت صدمے اٹھائے گی

نہیں، میں اپنی تنہائی کو اب تنہا نہ چھوڑوں گی

میں اس سے منہ نہ موڑوں گی

یہی بہتر ہے اب

واپس نہ آؤ تم......!

میں آنکھ ہوں

کہو ان نیلگوں آنکھوں میں کتنے آسماں ڈوبے
کہو یادوں کے اس صحرا میں کتنے کارواں بھٹکے
کہو ان جھیل سی آنکھوں میں کتنی کشتیاں ڈوبیں
کہو نینوں کے ساغر سے کہاں تک مستیاں چھلکیں
کہا میں آنکھ ہوں
منظر بھی میرا ہے
پس منظر بھی میرا ہے
میں خود ہی روشنی ہوں
اور......
مجھ میں ہی اندھیرا ہے
کہاں ڈوبا کوئی ان میں

کہاں ابھرا کوئی ان میں
مجھے کیسے خبر ہوتی
نگہ میری نئی دنیاؤں کے جھرمٹ میں رہتی تھی
ہزاروں ٹوٹتے تاروں کے ہر دم زخم سہتی تھی
تمھیں کیسے بتاؤں کس قدر بے تاب رہتی تھی
کسی اَن دیکھے قلزم میں سدا غرقاب رہتی تھی
سمندر میں بھی رہ کر ماہیِ بے آب رہتی تھی
مجھے کیسے خبر ہوتی......
کہ ان آنکھوں کے جادو نے
کسے مسحور کر ڈالا
کسے بے نور کر ڈالا......!

میں چور ہوں

ان آنکھوں سے دنیا کا نظّارہ نہیں ہوتا
میں آنکھ چرا لائی ہوں آہو کے بدن سے
پھولوں میں تو خوشبو کا فقط عکس ہے باقی
میں خوشبو چُرا لائی ہوں پھولوں کے چمن سے
ہوں رنگوں کی مالا میں پرویا ہوا موتی
سب رنگ چُرا لائی ہوں دھرتی سے، گگن سے
یہ کون سے رستے پہ قدم ڈول رہے ہیں
اک مستی چُرا لائی ہوں باہُو کے وطن سے
میں موت کی بانہوں میں کبھی مر نہیں سکتی
میں موت چُرا لائی ہوں اپنے ہی کفن سے
چہرے پہ مِرے اور کوئی رنگ نہ آئے
کچھ خاک چُرا لائی ہوں میں ارضِ وطن سے......!

خواب گر

خواب گر ہوں......
مِرے کانچ کے خواب ہیں
چوڑیوں کی بجائے
سجالو مِرے خواب بانہوں میں تم
خواب پہنو مِرے، خواب اوڑھو مِرے
میں بھی تن پہ سجائے قبا خواب کی
حالتِ خواب میں چل رہی ہوں
نئی منزلوں کی طرف......
راستے میں مِرے کوئی کانٹا نہیں
خواب کی فصل ہے لہلہاتی ہوئی

خوش نما خواب راستوں میں لٹکے ہوئے
ٹہنیوں پہ کہیں خواب اٹکے ہوئے
راستہ نیند میں جیسے بھٹکے ہوئے
خواب آنکھوں کی بانہوں میں سوئے ہوئے
خواب، خوابوں کے من میں سموئے ہوئے
خواب، خوابوں سے یوں مل رہے ہیں گلے
زندگی موت سے جیسے مل کے گلے
خواب ہو جاتی ہے
تھک کے سو جاتی ہے
کون جانے......
وہ کیسے نگر جاتی ہے......!

آنسو

بنا بادل......

کہو! گھر میں تمھارے کس لئے برسات رہتی ہے!

پرندے اُڑ گئے

ہاتھوں سے جو

اُن کے پلٹنے کی تمھیں کیوں آس رہتی ہے!

تمھاری آنکھ کے گھر میں یہ پانی کی فراوانی

فصیلوں کو نہ لے ڈوبے

بتاؤ!

کس لئے گھر بار پانی سے سجا ڈالا

اسے قلزم بنا ڈالا

بتاؤ کون سا خورشید اس آنگن میں اترے گا

جو اس گھر کے درو دیوار کی نم ناکیاں
اپنی حرارت سے سکھا دے گا
جو پانی اس قدر ارزاں بنا ڈالا
بہت انمول تحفہ ہے، ضرورت زندگانی کی
سنا ہے!
کچھ زمینیں تو ترستی ہیں اسی پانی کے قطرے کو
اسی پانی سے ہی......
بنجر زمیں سیراب ہو کر اک نئی کروٹ بدلتی ہے
کئی بے نام روحیں اک نئے سانچے میں ڈھلتی ہیں
نئے راہی، نئے جذبے، نئے ہی ولولے لے کر
نئی دنیاؤں کو تسخیر کرتے ہیں
یہ پانی ابتداء بھی ہے
یہ پانی انتہا بھی ہے
اِسی پانی کے قطرے کو ترستے ہیں دمِ آخر
یہی زمزم، یہی ہمدم
یہی آنکھوں کا ایندھن ہے

یہی دل کا مسیحا ہے
ذرا سی بات پر آنکھوں کو چھلکانا ہمیں اچھا نہیں لگتا
ذرا سوچو......
اگر آنکھوں کے سوتے خشک ہو جائیں
کسی دل دوز منظر پر
تمھاری آنکھ سے آنسو نہ گر نکلیں
تو اس سے بڑھ کے بھی کیا سانحہ ہوگا
حفاظت سے رکھو ان کو
بچا رکھو انھیں تم
یہ کسی دن کام آئیں گے......!

احساسِ ذات

مجھے ہونے اور نہ ہونے کا
احساس سا ہوتا رہتا ہے
میں جسم کی قید میں نہ ہوتی
تو کیا ہوتی!
کسی من کی مراد میں ہوتی میں
چُوڑی کی کھنک بن جاتی میں
یا......
رنگِ حنا میں ڈھل جاتی
ہاتھوں پہ بسیرا کر لیتی
یا......
پیار کو حاصل کرنے کی

کسی لب پہ دعا ہو جاتی میں
اب ہوں کہ نہیں، معلوم نہیں
کیا دُکھ ہوں میں یا درد ہوں میں
کسی ویراں آنکھ کا آنسو ہوں
یا جوت ہوں بجھتے دیپک کی
پیاسے ہونٹوں کی سسکی ہوں
یا بپھرے غم کا سمندر ہوں
میں ہوں کہ نہیں یا بے حد ہوں
اب ہونے اور نہ ہونے کا
احساس ہی باقی کوئی نہیں!

ہمیں اب تیز چلنا ہے

ہمیں اب تیز چلنا ہے
بہت ہی تیز چلنا ہے
ہمیں قندیل کی لو تیز کرنی ہے
اسی قندیل کی لو سے ہمیں
دل کے کسی تاریک گوشے میں چھپی
نیکی کی اک ننھی کرن کو ڈھونڈنا ہوگا
اسے رستہ دکھانا ہے
جو صدیوں کے سفر میں بھول کر رستہ
کہیں سہمی، کہیں سمٹی
سجا کر خواب آنکھوں میں
ہمارے راستے میں آنکھ بن کر دیکھتی ہوگی
قدم آگے بڑھاؤ تم

کہ اب پیچھے پلٹ کر دیکھنے کے
سارے لمحے کھو چکے ہیں
سبھی امکان اب گم ہو چکے ہیں
ہمارے خواب اب تحلیل ہو کر
وقت کی سولی پہ چڑھنے کے قریں ہیں
ہمیں نیکی کی اس ننھی کرن سے ہی
زمانے بھر کی تاریکی میں
اب سورج اگانے ہیں
ہمیں بیتی ہوئی صدیوں کے
سب احساں چکانے ہیں
ہمیں مرتے ہوئے انسان کو
پھر سے بچانا ہے
اسے ارفع......
اسے اعلیٰ......
اسے اشرف...... بنانا ہے!

غمِ حیات

یہ بجھی بجھی ہوئی چاندنی
یہ اداس اداس سا کارواں
مِرے ساتھ جائے گا کب تلک
مِرے پاؤں میں کئی آبلے
بڑی دیر سے ہیں پڑے ہوئے
تِری بے وفائی کے زخم تو
مِری روح پر ہیں لگے ہوئے
مِرا پیرہن ہے شکن شکن
مِرا رنگ روپ اداس ہے
مِرے روز و شب ہیں لٹے ہوئے
تِرے غم نے میری حیات کے
سبھی چاند تارے بجھا دیئے

میرا حوالہ

میں عورت ہوں......

مِرے کتنے حوالے ہیں

میں ماں ہوں، میں بہن ہوں

بیٹی ہوں، میں بیوی ہوں

مگر ان میں......مِرا اپنا حوالہ کون سا ہے!

مِرے دل کے سمندر میں

بڑی انمول سیپی ہے

بڑا ہی آب دار اور بے بہا

موتی جو اس میں ہے

وہی میرا حوالہ ہے

وہی میرا اُجالا ہے......!

عورت

کہا کیوں یہ تری بندی زمانے میں اکیلی ہے
جواب آیا، تری تنہائی ہی تیری سہیلی ہے

کہا عورت کو کیوں سمجھا نہیں ہے آج تک کوئی
جواب آیا، کہاں سمجھیں گے عورت تو پہیلی ہے

کہا نازک مرے جذبے مگر اونچے ہمالہ سے
جواب آیا کہ تو ماں ہے کوئی چمپا چنبیلی ہے

کہا وہ بے اماں بچے جو پلتے ہیں یتیمی میں
جواب آیا کہ تو خوش بخت ہے آنگن میں کھیلی ہے

کہا جب ہم سفر رستے میں کھو جائے تو پھر کیا ہو
جواب آیا ، تری اولاد ہی تیری سہیلی ہے

کہا اولاد کا تحفہ تو ملتا ہے نصیبوں سے
جواب آیا کہ عورت پھر اکیلی ہی اکیلی ہے

قبر سے سوال

سنا ہے......
گھر میں تیرے بادشاہی ہے اندھیروں کی
بچھونا خاک کا خستہ درودیوار لے کر
تو ازل سے منتظر سب کی
ترے چہرے کی تاریکی، تری آغوش کی ٹھنڈک
ہمیں بے حد ڈراتی ہے
یہ کیسی میزبانی ہے کہ ہم مہمان بنتے ہیں
تو تُو نظریں چراتی ہے
تری آغوش تو آغوشِ مادر ہے
وہی نرمی، وہی گرمی، وہی الفت
وہی پُر نور سا چہرہ
جو اک ماں کا اثاثہ ہے

کہاں تُو نے چھپایا ہے
تِری نظروں میں یہ بیگانگی کیسی
تِری آغوش میں جب سماتی ہے
تو سچ کہنا......!
کہ تو اجڑے درودیوار کو
کیسے سجاتی ہے......!

سوچ سمندر

(میراجی کے لئے ایک نظم)

ہمیں لفظوں کے جنگل سے
بہت آگے نکلنا ہے
ہمیں الفاظ کے ان دائروں کی سمت جانا ہے
جہاں پاؤں میں گھنگرو باندھ کر
مدہوش جذبے رقص کرتے ہیں
ہماری سوچ کے رستے میں
جتنے بھی سمندر ہیں
ہمیں سب پار کر کے
ان جزیروں پر اترنا ہے
جہاں مدت سے تنہائی کی دلھن

مانگ میں افشاں سجائے
منتظر ہے وصل کے انمول لمحوں کی
ہمارے راستے میں......
آئینوں کے شہر آئیں گے
ہمیں رستے میں حائل سب فصیلوں کو
کسی جذبے کی ٹھوکر سے گرانا ہے
ہمارے پاؤں سے لپٹے ہوئے جتنے سمندر ہیں
ہمیں کڑوے کسیلے پانیوں کو
اسمِ اعظم پڑھ کے
زم زم میں بدلنا ہے
بدن کی چاندنی......
صحرا کی تپتی ریت میں کندن بنانی ہے
کہیں سے ڈھونڈ کر ہم کو
کٹھالی عشق کی لانی ہے
جس میں مرغِ بسمل کی طرح سے رقص کرنا ہے
ہمیں جانا ہے نگری پیار کی

اور گھر کا رستہ بھول جانا ہے
ہمیں صحرا کی تپتی ریت میں رستے بنانے ہیں
انہی حدّت بھرے رستوں پہ چل کے
سوچ کے آئینہ خانوں میں اترنا ہے
جہاں الفاظ کی دیوی
قلم کا دیوتا
کاغذ کے رتھ پر بیٹھ کر
اہلِ قلم کی سوچ کو......
اپنی سلامی پیش کرتے ہیں......!

نثری نظمیں

حسنِ ترتیب

مجھے کچھ کہنا ہے

مشہور انگریز ناول نگار چارلس ڈکنز کے ناول ''ڈیوڈ کاپر فیلڈ'' کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ:

The pen that wrote "David Copperfield" was dipped in his own blood

کچھ ایسی ہی کیفیت یہ نظمیں لکھنے کے تخلیقی عمل سے گزرتے ہوئے مجھ پر بھی گزری۔ کہیں آپ بیتی ہے، کہیں جگ بیتی ہے۔ لیکن آپ بیتی کو یوں رقم کرنا کہ اس کا درد ہر دل میں اتر جائے اور جگ بیتی کو یوں محسوس کرنا کہ آپ کی آنکھ سے ڈھلکنے والا آنسو قلم کی سیاہی میں جذب ہو کر صفحۂ قرطاس پر بکھر جائے، یہی قلم کی معراج ہے، یہی لکھنے والے کی منزل ہے۔ اس کیفیت سے گزرتے ہوئے مجھے احساس ہی نہیں ہوا کہ کون سی واردات خود مجھ پر گزری اور کون سی واردات میرے مشاہدے میں آئی۔ میری زیادہ تر نظمیں معاشرے میں خواتین کے سماجی مسائل پر ہیں۔ میں یہ تو نہیں جانتی کہ میں خواتین کا مقدمہ پیش کرنے کے مقصد میں کس قدر کامیابی سے ہمکنار ہوئی ہوں۔ لیکن اتنا ضرور جانتی ہوں کہ ہماری عورت کے دکھوں کی داستان نہ صرف طویل ہے بلکہ الم ناک بھی ہے۔ اکیسویں صدی میں داخل ہونے کے باوجود عورت کے دکھ ابھی تک عورت کے دکھ درد ہیں۔ صنفِ مخالف کے لئے ان دکھوں کا ادراک کرنا تو دور کی بات ہے، ابھی تک وہ اسی یقین اور بے یقینی کی سولی

پر لٹک رہے ہیں کہ عورت کے حقیقت میں کوئی دُکھ ہیں بھی یا سب ڈھونگ ہے؟ اس کا مشاہدہ تو میں ہر روز اُگنے والے سورج کے ساتھ کرتی ہوں مگر قارئین کے لئے ایک چھوٹی سی مثال پیش کرنا چاہتی ہوں۔ ایک صاحب نے میری نظمیں پڑھ کر کہا، ''بڑی ہی دردناک نظمیں ہیں لیکن کیا عورت واقعی اتنی ہی مظلوم اور دکھی ہے؟''

اس میں شاید ان صاحب کا کوئی قصور نہیں ہے کیوں کہ یہی سوچ عام طور پر ہمارے معاشرے میں عورتوں کی طرف پائی جاتی ہے۔ عورت کی جسمانی ضروریات کو پورا کر کے ہم سمجھتے ہیں کہ فرض ادا ہو گیا۔ لیکن کچھ نمازوں میں فرضوں کے ساتھ ساتھ سنتیں اور نوافل بھی ضروری ہیں۔ میرے خیال وہ عورتیں خوش قسمت ہیں جن کے لئے فرضوں کی ادائیگی ہی ہو جاتی ہے۔ وگرنہ بہت سی عورتیں تو اس سے بھی محروم رہتی ہیں۔

روٹی، کپڑا اور چھت کا آسرا تو قیدیوں کو جیل میں بھی مل جاتا ہے۔ یہاں بات عورت کی ہو رہی ہے جو مرد کی ضرورت ہے۔ قدرت نے جس کی تخلیق میں اپنے سارے رنگ، سارے جذبے سمو دیئے ہیں جسے ماں بنا کر نسلِ انسانی کی صرف جسمانی ضرورتیں ہی نہیں، ذہنی، روحانی، نفسیاتی، جذباتی اور اخلاقی ضرورتیں پورا کرنے کی ذمہ داری بھی اس پر ڈالی گئی ہے۔

ہماری بدقسمتی یہ رہی ہے کہ عورت کو ہمیشہ مختلف رشتوں کے تناظر میں ہی دیکھا جاتا ہے۔ خود اس کی ذات کا شعور اور ادراک نہیں ہوتا۔ کسی بھی رشتے کے فریم میں فِٹ ہونے سے پہلے وہ ایک فرد ہے، ایک انسان ہے۔ اپنے خاص جذبات و احساسات، نظریات، سوچ اور فکر رکھتی ہے۔ عورت کی عزتِ نفس پر پہلا تازیانہ اس کی ذات کی ہی نفی کر کے اس کے قلب و ذہن پر پڑتا ہے۔ ساری زندگی وہ اپنی مجروح انا کو اٹھائے پھرتی ہے۔ اسے احساس دلاؤ بھی تو وہ بے یقینی سے اپنے آپ کی طرف دیکھتی ہے کہ کیا واقعی میں اپنی ذاتی حیثیت میں قابلِ احترام ہوں؟ میں تو ماں، بہن، بیٹی اور بیوی کے علاوہ کسی اور حوالے سے

معتبر ہی نہیں ہوں۔ یہی عورت کا دُکھ ہے، یہی اس کا المیہ ہے، یہی اس کی کہانی ہے۔

عورت فرسودہ رسم و رواج، تنگ نظری اور تعصب کے جس پنجرے میں قید ہے، اس میں قصور سراسر مرد کا نہیں ہے۔ اسے قیدی بنانے میں خود عورت بھی بہت اہم کردار ادا کرتی ہے۔ ذہن اور ضمیر کی یہ قید عورت کبھی شعوری طور پر اور کبھی غیر شعوری طور پر اپنی صنف پر لاگو کرتی ہے۔ کبھی ساس، کبھی نند، کبھی سوتیلی ماں اور اکثر و بیشتر ماں بن کر۔

ماں کا حوالہ اس لئے دے رہی ہوں کہ اس سے محترم اور معزز رشتہ اس روئے زمین پر اور کوئی نہیں مگر بیٹے کی تربیت کرتے وقت وہ اسے دوسرے رشتوں کے فرائض اور تقدس سے تو آگاہ کرتی ہے لیکن شریکِ حیات کے بارے میں ڈنڈی مار جاتی ہے۔ ہر رشتے کی اپنی جگہ ہے، ہر رشتے کا اپنا مقام ہے۔ ہر ایک کے دائرے جب متعین کر دیئے گئے ہیں تو ایک رشتہ دوسرے کا استحصال کیوں کرے؟ یہ صرف اور صرف اس سوچ اور تربیت کا نتیجہ ہوتا ہے جو صدیوں سے عورت کے بارے میں چلی آرہی ہے۔ ہماری عورتیں اگر تعلیم کی روشنی سے بہرہ ور نہیں ہیں تو اسی ناروا سوچ اور طرزِ عمل کو آگے بڑھاتی ہیں۔ بیٹی اور بہو کے لئے الگ الگ پیمانے مقرر کیے جاتے ہیں۔ جو چیز بیٹی کے لئے جائز ہے وہی بہو کے لئے قابلِ اعتراض۔ بیٹی اگر قابل اور ذہین ہے تو اس کا بہت فخر اور شوق سے ذکر ہوگا۔ اگر بہو میں کوئی قابلیت ہے تو اس کا اعتراف تو دُور کی بات ہے، الٹا وہ اس کا عیب شمار ہوگا۔ بیٹی کے لئے ہماری سوچ ہوتی ہے کہ جس گھر میں جائے، اس کی حکمرانی ہو، اس کی پذیرائی ہو، اس کی ذات، اس کی قابلیت کا احترام ہو۔ مگر بہو کو ہم چاہیں گے کہ وہ زیرو بیس (Zero Base) سے شروع کرے۔ یہ ظلم نہیں تو اور کیا ہے؟

صنفِ مخالف کو شکایت رہتی ہے کہ عورتوں کے مسائل پر قلم اٹھانے والی عورتیں، عورتوں کو مردوں کے خلاف کر دیتی ہیں۔ ان میں صنفِ مخالف کے لئے نفرت کا زہر بھرتی ہیں۔ میں ذاتی طور پر اس اپروچ کے خلاف ہوں بلکہ میرا موقف یہ ہے کہ مرد اور عورت

ایک دوسرے کی تکمیل کے لئے بنائے گئے ہیں، کسی قسم کی مسابقت یا ایک دوسرے کی ذات کی نفی کرنے کے لئے پیدا نہیں کیے گئے۔

نفرت مرد ذات سے نہیں، ان غلط رویوں، سوچوں اور نظریات سے ہوتی ہے۔ وگرنہ انسان تو قابلِ احترام ہے، قدرت کی بہترین تخلیق ہے، اس سے نفرت چہ معنی دارد؟ نہ صرف مرد بلکہ عورتیں بھی دوسری عورت کی صلاحیت کا اعتراف کرنے میں بخل سے کام لیتی ہے۔ عورت کی صلاحیت کا اعتراف کرتے وقت ہمارا رویہ معذرت خواہانہ سا ہو جاتا ہے۔ گویا ایک خود مختار ذہن رکھنا، انفرادی سوچ اور فکر رکھنا ایک عورت کے لئے شجرِ ممنوعہ ہے۔

عورت کی ذہنی بالیدگی میں اتنی رکاوٹیں کھڑی کی گئی ہیں کہ اب اس گرداب سے نکلنے کا کوئی راستہ نظر نہیں آتا۔ اسی کش مکش میں وہ جُز بُز ہوتی ہے۔ کبھی غصے کا اظہار کرتی ہے، کبھی اسے دباتی ہے، ڈیپریس ہوتی ہے۔ سوچوں کے تانے بانے بنتے ہوئے کبھی جارح (Aggressive) ہوتی ہے تو کبھی رو پڑتی ہے۔ کبھی نفرت تو کبھی محبت۔ کبھی بے چارگی تو کبھی آہنی ارادوں کا اظہار۔ لیکن مثبت طریقے سے بات منوانے، اپنے حق کے لئے آواز اٹھانے کا ڈھنگ چوں کہ اسے بچپن سے ہی نہیں سکھایا جاتا، اس لئے چند تعلیم یافتہ اور با اعتماد عورتوں کو چھوڑ کر اکثریت میں اعتماد (Assertiveness) نہیں ہے۔

برطانیہ میں پچیس سال کا عرصہ گزارنے اور پندرہ سال سوشل ورک کے شعبے سے وابستگی کے دوران برطانیہ میں عورت کی تذلیل اور بے بسی کے بہت سے مناظر دیکھ چکی ہوں۔ عورت کو کائنات میں ماں کے روپ میں سب سے بلند مقام عطا ہوا لیکن اس مقام کے ادراک اور شعور کے لئے ضروری ہے کہ عورت پہلے اپنے آپ کو سمجھے۔ اپنے اندر کی عورت سے ہاتھ ملائے، اس کے گلے ملے، اس سے دوستی کرے، اسے تلاش کرے۔

She must be in touch with her innerself

ہماری بے اعتنائی کے نتیجے میں ہمارے اندر کی عورت شکوہ کرتی ہے، آنسو بہاتی ہے

اور ایک دن آنسوؤں کے سمندر میں ڈوب کر زندگی کی قید سے آزاد ہو جاتی ہے۔ ہمیں اس ڈوبتی ہوئی عورت کو بچانا ہے، اسے کنارے پر لانا ہے، اس کی تیمارداری کرنی ہے تا کہ وہ زندگی کے دھارے میں فخر و انبساط کے ساتھ شریک ہو سکے۔ اس کے لئے نہ صرف صنفِ مخالف کو بلکہ خود ہماری صنف کو بھی اپنی سوچوں کے بادبانوں کو کھول کر سفینوں کو صحیح سمت میں موڑنا ہے تا کہ ہماری عورت فخر سے کہہ سکے کہ

I am a woman..................

ڈاکٹر رضیہ اسماعیل
برمنگھم
۷/مارچ ۲۰۰۰ء

عقوبت خانے

زندگی کے عقوبت خانے میں
صرف جسم ہی قید نہیں ہوتے
ضمیر دربان بن جاتے ہیں
سوچوں کے چہرے پر سیاہی مل دی جاتی ہے
خیالوں کے پاکیزہ بدن کو
ناپاک ہاتھ چھوتے ہیں
اندھیرا روشنی کی آبروریزی کرتا ہے
رات، دن کی داشتہ بنتی ہے
خواب اندھے ہو جاتے ہیں
خوشبو بیوہ ہو جاتی ہے
عورتیں مرد بن جاتی ہیں......!

خراج

سورج نے دن سے
روشنی کا خراج مانگا......
اس کا چہرہ تاریک ہو گیا
سمندر نے آنکھوں سے
پانی کا خراج مانگا......
آنکھیں خشک ہو گئیں
عورت نے مرد سے
محبت کا خراج مانگا......
وہ راندۂ درگاہ ٹھہری!

نیلی رگیں

درد کی نیلی رگوں میں......
مضبوطی سے گرہ لگاؤ......
ان کے سر پر......
سخت گیر دربان بٹھاؤ
دنیا کے خزانوں میں جتنے بھی
ظاہر اور پوشیدہ
جوان اور عمر رسیدہ
معصوم و جہاں دیدہ
زمرد و الماس
عقیق و مرجان
فیروزہ اور پکھراج
نیلم اور مونگے

سنگ موسیٰ اور سنگ دودھیا ہیں
ان سب کو......
سنگ بادل کے سنگ سنگ اُڑا کر لاؤ
موتی، لعل اور ہیروں سے تراشیدہ
خوب صورت طشتریوں میں سجاؤ
میرے سانسوں کی حدّت سے ان سب کو آگ لگاؤ
کہ میرے درد کی شدّت میں کچھ تو کمی ہو......!

مدر ٹریسا

مدر ٹریسا بھی کیسی عورت تھی!
ہزاروں لاکھوں گھروں میں اس کا ذکر
مگر اپنا کوئی گھر نہ تھا!
کتنے ہی بے آسرا بچوں کی بن بیاہی ماں
مگر اپنی کوکھ اجاڑ!
کیا اس نے یہ سب سوچ کر
راتوں کو بستر پر کروٹیں بدلیں!
کیا اس کی کوکھ روئی!
کیا اس کی چھاتیوں میں
دودھ کی نہریں بہیں!
کیا اس نے بار بار
گھر کی دہلیز پر آ کر

کسی کے انتظار کا دُکھ اٹھایا!
انتظار تو عورت کی وراثت ہے
اور کچھ ملے نہ ملے
انتظار تو مل ہی جاتا ہے
کیسی عورت تھی مدر ٹریسا!
جسے انتظار کے کرب سے بھی
گزرنا نہیں پڑا......!

خوش قسمت

ہم خوش قسمت ہیں
ہمارے کتنے ہی نام ہیں
مجبور عورتیں، محصور عورتیں
لاچار عورتیں، ریا کار عورتیں
گنہگار عورتیں، کم فہم عورتیں
کم نظر عورتیں، بدگماں عورتیں
بے صبر عورتیں، بدزباں عورتیں
ہم ناشکری
ہم مسلی ہوئی
دھتکاری ہوئی
بیسوا!

بے وفا، بے نشاں

بے حیا، بے اماں عورتیں

مگر

ہمارا ایک ہی نام

کائنات کے سب ناموں پر بھاری ہے

''ماں عورتیں''......!

چاندنی

اس نے پیار سے مجھے چندا کہا
میں چاندنی میں ڈھل گئی
کرنوں کے چراغوں سے
مِرا وجود جگمگا اٹھا
مگر......
اس روشنی میں مجھے
اس تک پہنچنے کا رستہ نہ مل سکا!

جاگیر

زمیں نے صدا لگائی
"تم عورت ہو یا مرد کی جاگیر......
فصل تمھارے تن پر پکتی ہے
مالک کوئی اور کہلاتا ہے
تم سے تو وہ مزارع ہی اچھا ہے
جسے فصل کا کچھ حصہ ہی دے دیا جاتا ہے
تمھاری محنت کا معاوضہ
تمھیں کس شکل میں ملتا ہے......!

متلاشی آنکھیں

گونگی دیواروں پر
متلاشی آنکھیں
وصال کے لمحے
ہجر کی کرب ناکیاں
محبت کا پہلا ستارہ
دم توڑتا ہوا چاند
تعلق کی خوشی
لاتعلقی کا دُکھ
آخر کیا تلاش کرتی ہیں!
ان کے صبر کا پیمانہ چھلکنے کو ہے
تلاش میں ناکام ہو کر......

یہ اپنی آنکھیں نوچ ڈالیں گی
میں اس وقت سے خوف زدہ ہوں
جب یہ آنکھیں
مِرے وجود پر آلگیں گی
اور......
زندگی بھر کسی کے انتظار میں
کھلی رہیں گی......!

ہوا کا جھونکا

میرے عہد کی عورت
نہیں...... ہر عہد کی عورت
بہت بہادر رہی ہے اور رہے گی
روز جیتی ہے، روز مرتی ہے
سپنے بُنتی ہے، ادھیڑتی ہے
خواب چُنتی ہے، بکھیرتی ہے
آس لگاتی ہے، نراش ہوتی ہے
چراغ جلاتی ہے، اندھیرا بڑھتا ہے
کلائیوں میں پیار کے کنگن
بالوں میں وفا کے گجرے......
آنکھوں میں دیدار کا کاجل لگا کر

روز بنتی ہے، سنورتی ہے
سراپا انتظار!
مگر اس کی چوکھٹ پر
ہوا کے جھونکے کے سوا
کوئی نہیں آتا......!

پیار کی حرارت

دن کی روشنی ہو یا رات کی تاریکی
میں بہت سے مکانوں کو
ہوا میں معلق دیکھتی ہوں
یہ وہ مکان ہیں جو مکینوں کے باوجود خالی رہے
انھوں نے مکینوں کو قبول نہ کیا
اور مکینوں کی قسمت میں
ان کی چار دیواری کا سکھ نہیں تھا
یہ مکان زمین پر بوجھ بنے رہے تھے
دھرتی نے انھیں آسمان کی طرف اچھال دیا
کیوں کہ......
جو مکان کبھی گھر نہ بن سکے

وہ زمین وآسمان کے درمیان معلق ہوجاتا ہے

مکان کو گھر بنانے کے لئے......

پیار کی حرارت چاہیے

محبت کی بصارت چاہیے

وفا کی جسارت چاہیے......!

پتھر کے خواب

دُکھ کی لمبی تاریک راتوں میں
میں اکثر خود سے بچھڑ جاتی ہوں
کسی نظر نہ آنے والی بھیڑ میں گم ہو جاتی ہوں
ہر کھڑکی، ہر دروازے پر جا کر
خود کو تلاش کرتی ہوں
شاید بے خیالی میں باہر نکل گئی ہوں
واپس آ کر بستر کو ٹٹولتی ہوں
بے شکن بستر، بے شکن تکیہ
اس بات کے گواہ ہیں
کہ انھوں نے آج کی رات
کسی کو نیند کا سُکھ نہیں دیا

سُکھ!

جو مجھ سے روٹھ کر
کسی نادریافت شدہ جزیرے میں جا بیٹھا ہے
اور پیچھے اپنے قدموں کے نشان تک مٹا گیا ہے
اسی کش مکش میں صبح کی روشنی
رات کی گود میں آرام کر کے نکھری نکھری سی
میرے درودیوار پر دستک دیتی ہے
اگر یہ مجھ سے سوال کرے گی
کہ میں رات بھر کیوں نہیں سوئی!
تو اس سے کہہ دوں گی
میری زندگی کی حقیقتیں بہت تلخ ہیں
مجھے سوتے ہوئے ڈر لگتا ہے
کہیں میرے خواب پتھر بن کر
مجھے لہولہان نہ کر دیں......!

سوتیلی بیٹی

میں یتیم ——
بنت یتیم ——
بچپن سے جوانی تک
پیار کی چاہ میں جیتی اور مرتی رہی
بچپن میں بابل چھوڑ گیا
سب رشتے ناتے توڑ گیا
پھر ——
سوتیلا باپ ملا ——
اس نے مجھے بیٹی نہ کہا
میں اس کی بیوی کے پہلے شوہر کی بیٹی کہلائی
اور اس کے لئے ——
صرف ایک عورت

جوان، بے سہارا، پُرکشش
کیا میرا باپ نہیں جانتا تھا کہ
بیٹیاں اگر باپ کے سائے میں
پل کر جواں نہ ہوں
تو ان کے خواب سلامت نہیں رہتے......!

بونے

کوہ قاف میں جا کر
بونے......
دیکھنے کی مجھے بہت خواہش تھی
دنیا میں......
قد آور لوگوں کو قریب سے دیکھا
میری خواہش کی تکمیل ہو گئی!

عقل مند

عورت
ناقص العقل ہے
محبت میں سب کچھ لٹا دیتی ہے
مرد
عقل مند ہے
بہت کچھ بچا لیتا ہے......!

بارُود

بدبُو دار......تاریک......سیال مادہ
میری روح کی نرم و نازک زمین پر
رینگ رہا ہے......
میری چھاتیوں سے......
دودھ کی دھاریں نہیں
نوکیلی گولیاں ٹپک رہی ہیں
میرے شیر خوار بچے کی پاکیزہ سانسوں میں
بارُود کی بُو رچی بسی ہے
دنیا کے تمام پھولوں سے
کشید کی ہوئی خوشبوئیں لاؤ
اور......
میرے بچے کی پاکیزہ سانسوں کو بحال کرو......!

پناہ گاہ

(بابا کی جدائی پر)

ماں کی محبت
اگر روح کا نور ہے
تو باپ کی محبت
ہزاروں سورجوں کی روشنی ہے
روشنیاں بچھڑ جائیں
تو بدنصیبی دستک دینے لگتی ہے
روح آوارگی کا چولا پہن کر
اجنبی زمینوں پر دشت نوردی کرتی ہے
زندگی کے ساحل پر لنگر انداز ہونے کے لئے
ریت کو پکڑنا پڑتا ہے

وقت ہاتھوں میں سوراخ کر دیتا ہے
ریت ان سے چھن چھن کر
ساحل کی گود میں پناہ ڈھونڈتی ہے
مگر......
محرومِ محبت کے لئے کوئی پناہ گاہ نہیں......!

نقاب

بدن......

روح کا نقاب ہے

لطیف پردوں سے

روشنی منعکس ہوتی ہے

دبیز پردوں میں

روشنی دم توڑ دیتی ہے

روشنی مرجائے تو......

اندھیرے یتیم ہو جاتے ہیں

کتبے

عورتوں کی قبروں پر ایستادہ
بڑے بڑے کتبے دیکھ کر سوچتی ہوں
ان قبروں پر اتنی عنایت کیوں!
کیا یہ کتبے محبتوں کے مظہر ہیں
یا......
احساسِ جرم کے کفارے
جو موت کے بعد ادا کیے جا رہے ہیں
احساسِ جرم بھی......
انسان سے کیا کچھ کروا لیتا ہے!

سورج کی موت

(اپنے بابا کے لئے......)

سورج کی موت پر

اندھیرے پھوٹ کر روئے

کائنات کی ہر شے متوجہ ہوگئی

آسمان زمین کی خبر گیری کو لپکا

ہوائیں سہم کر کونے میں جا بیٹھیں

پرندوں کے پر پتھر کے ہو گئے

ماؤں کی کوکھ میں پڑے کچے پکے بچے

قبروں میں گناہ و ثواب کا حساب دیتے

زندہ و مردہ جسم......

اندھیروں کو دلاسا دینے کو لپکے

فرشتوں نے ڈر کر
سورج کی روح کو
اور احتیاط سے ہاتھوں میں پکڑ لیا
روح اگر دوبارہ بے جان وجود میں
آسرا ڈھونڈنے لگے
تو موت کو موت آجاتی ہے......!

چھاؤں

بوڑھے درخت نے
راز داری سے کہا
"کچھ گھنے درخت
ایسے بھی ہوتے ہیں
جن کی چھاؤں نہیں ہوتی!"

دھنک رنگ

مجھے مٹانا ہوتو

پہلے میرے ہاتھوں کی لکیروں کو مٹاؤ

میں جانتی ہوں تم ایسا نہیں کر سکتے

کیوں کہ......

ان لکیروں کی طرح میں بھی اَن مِٹ ہوں

روح کا پرندہ جب جسم کا پنجرہ توڑ کر

آزاد ہوجائے تو صرف جسم مٹتا ہے

مگر میں نئی زمینوں پر

ہمیشہ زندہ رہوں گی

کہکشاں بن کر

کسی اور آسمان کا چاند......

کسی دل میں حسین یاد......

کسی آنکھ کا آنسو......

کسی لب کی فریاد......

کسی فریم کی تصویر......

کسی پاؤں کی زنجیر......

کسی قبر کی جاگیر بن کر......

کیوں کہ......

میں دھنک رنگوں سے بنی

''عورت ہوں''

بے گور لاش

میں شاخوں سے گرے
زرد پتوں کو دیکھتی ہوں
خزاں کی اُجڑی دوپہروں میں
ہواؤں کے بین سنتی ہوں
بہت سے ٹوٹے پھوٹے گھر
میری سوچوں میں چلے آتے ہیں
زمین پر گرے زرد سوکھے پتے
مجھے وہ بچے لگتے ہیں
جو جھوٹی اناؤں کی بھینٹ چڑھ گئے
بین کرتی ہوا مجھے وہ عورت لگتی ہے
جس سے گھر ہستی کا سُکھ چھین کر
دُکھوں کے کفن میں لپیٹ کر

بغیر دفنائے ہی......

قبر کے پاس چھوڑ دیا گیا ہو

کیوں کہ......

قبر میں اتارنے والے ہاتھ

حالات کے بے رحم تھپیڑوں نے

اس کے ہاتھوں سے جدا کر دیئے تھے......!

بدن میں آنکھ

میرے بدن کے
ہر پور میں ایک آنکھ ہے
ہزاروں آنکھیں
رکھنے کے باوجود
دنیا مجھے اندھا بنانے پر تلی ہوئی ہے
کبھی کسی نے
ایسا اندھا دیکھا ہے
جو آنکھ والوں کو رستہ دِکھائے......!

سرگوشی

ہوا نے سرگوشی کی
"روشنی کے بعد
تاریکی ہی ہوتی ہے
انجام کی پروا کیے بغیر
تم چراغ جلاتی رہو......!"

کچھ بھی تو نہیں بدلا

آنکھوں کی پتلیوں سے بندھے
ریشمی دھاگے......
جنھیں ماضی......
کبھی اپنی گھپاؤں میں کھینچتا ہے
کبھی حال......
دست و گریباں ہے
اور مستقبل......
دُور کھڑا مسکرا رہا ہے
آنکھیں......
ماضی کے اندھیروں میں بھٹک رہی ہیں
حال......
آنکھوں پر ہاتھ رکھتا ہے

مگر تاثیرِ مسیحائی ناپید
ہاتھوں سے......
شرارے پھوٹتے ہیں
شراروں کے اندر......
وقت کی رقاصہ......انگاروں پر ناچ رہی ہے
ریشمی ڈوریاں کھینچ کر
وہ میری آنکھیں اچک لیتی ہے
بے نور آنکھیں......
اندھے ماضی......اَن دیکھے مستقبل میں
پیوست ہوجاتی ہیں
حال کے شہزادے کا ہاتھ پکڑے
میں خواب محل سے باہر آگئی ہوں
وہی درماندگی......
وہی بدصورتی......
وہی تاریکی......
باہر کچھ بھی تو نہیں بدلا......!!

روح کا جشن

روح خوابیدہ وجود کو
نہ جانے کہاں
اُڑائے اُڑائے پھرتی ہے
بدن نیند سے بیدار ہوتا ہے
روح قیدی بن جاتی ہے
رات روح کا رتجگا ہے
دن کی روشنی
روح کا میلا اجاڑ دیتی ہے......!

جل تھل

آسمان طیش میں آیا
''زمین جل تھل ہوگئی''
مرد طیش میں آیا
''عورت جل تھل ہوگئی''
آنسو اس کے دل پر گرے
''تو روح جل تھل ہوگئی''......!

آدھی عورت

آدھی عورت کے آسمان پر
چاند ستارے نہیں اگتے......
اس کی مٹی کسی کو زندگی نہیں دیتی
کچا مکان بارش میں بہہ جاتا ہے
درد اُس سے منہ موڑ لیتا ہے
زمین آبلہ پا کر دیتی ہے
آسمان سایوں کو سمیٹ لیتا ہے
آدھی عورت کا دُکھ......
اجاڑ کوکھ کا دُکھ......
اگر کوئی جان سکے......
تو زہر کے ہزاروں پیالے

ایک ہی گھونٹ میں پی لے
سقراط حیرت سے منہ دیکھتا رہ جائے
زہر شرمندہ ہو جائے
سانپ خودکشی کر لیں......!

بند کواڑ

بند کواڑوں کے پیچھے......

ریزہ ریزہ خواب

بہتے کاجل

ڈھلکتے آنچل

ٹوٹی چوڑیاں

مرجھائے پھول

گرتی دیواریں

خون کے دھبے

چادر اور چاردیواری کی تلاش میں

سرگرداں عورتیں......!

ستارے

ہماری سوچوں میں......
زندگی اور موت کا فاصلہ ہے
مہد سے لحد تک کی دُوریاں ہیں
اندھیرے سے روشنی تک کی جدائیاں ہیں
بہار کی پہلی کلی چٹکنے سے لے کر
خزاں میں آخری پتّا گرنے تک کا ماتم ہے
دھرتی کی مٹیالی رنگت
اور آسمان کی نیلاہٹوں کا فرق ہے
آنسوؤں سے ہنسی تک کا سفر ہے
خواب سے تعبیر تک کا خوف ہے
بلندی اور پستی کا خلا ہے

یقین کے جنگل سے بے یقینی کے صحرا کی ریت ہے
ہوش و خرد سے......
جنون و مستی تک کا بحرِ بیکراں ہے
شاید......
ہمارے ستارے نہیں ملتے!

دریدہ بدن

اندھیرا وقتی طور پر
روشنی کو سمیٹ سکتا ہے
لیکن سدا کے لئے روشنی کو
اپنی بانہوں میں قید نہیں کرسکتا
روشنی کی بے قراریاں
اندھیرے کا وجود چھلنی کردیں گی
دریدہ بدن اندھیرا......
پھر روشنی سے کیسے نظر ملائے گا!

پیاس

میں ننگے پاؤں......
ویران ساحلوں کی ریت پر
تنہا تنہا......
برسوں سے چل رہی ہوں
سوچتی ہوں......
کہ ساحل کی بھیگی بھیگی ریت
ایک دن میری سوختہ روح میں
چاند کی کرنوں جیسی ٹھنڈک بھر دے گی
مگر میری تشنگی بڑھتی ہی جاتی ہے
سمندر بھی تماشائی ہے
میرے دُکھ پر اُس کی آنکھ نم نہیں ہوتی

سمندر کی وسعتیں سراب لگتی ہیں
یہ میری پیاس کیا بجھائے گا!
ایک بوند پانی کی تلاش میں
یہ تو خود جنموں کا پیاسا ہے......!

عالمِ دیوانگی

تیری یادیں......

مجھے نڈھال کر دیتی ہیں

میں عالمِ ہوش سے

عالمِ دیوانگی میں جا نکلتی ہوں

تیری یادوں کو چھوتی ہوں

انھیں محسوس کرتی ہوں

کیوں کہ......

اس لمحے تیری یادیں نہیں

تو خود وہاں موجود ہوتا ہے

دستک

دنیا سے جانے والے
لوٹ کر آتے تو ہوں گے
مگر!
گھروں کے بند دروازے دیکھ کر
لوٹ جاتے ہوں گے
ان کے انتظار میں......
گھروں کے دروازے کھلے نہیں رکھے جاتے
کیوں کہ روح کے نرم و نازک ہاتھ
گھروں کے بند دروازوں پر دستک نہیں دے سکتے
اسی لئے دنیا سے جانے والے
خواب نگر کے باسی بن جاتے ہیں

جدائی

تمھاری جدائی کا منظر
برف کی سِل کی طرح سے منجمد ہو کر
میری آنکھوں میں ٹھہر گیا ہے
اس کے بعد کوئی منظر بھی......
نگاہوں میں نہیں ٹھہرا!
تم ہی بتاؤ، برف کی سِل پر
کوئی چیز کتنی دیر تک ٹھہر سکتی ہے!

کشتیٔ دل

کہتے ہیں کہ......

ہر دل کے سمندر میں

اِک کشتی ہوتی ہے

اس کشتی کی پتواریں پیار اور محبت ہیں

ایسی پتواریں ہر ایک کے نصیب میں کہاں

وہ لوگ خوش بخت ہیں

جنھیں نہ صرف ایسی پتواریں

بلکہ مانجھی بھی مل جائیں

جو انھیں محبت کی چھاؤں چھاؤں

ساحلِ مراد تک لے جائیں......!

خواہشِ ناتمام

دل نے ہمیشہ یہی چاہا
کہ تم لوٹ کر آ جاؤ
مگر یہ معلوم نہیں تھا
کہ تم واپس آنے کی خوشی میں
ہمیں ہی بھول جاؤ گے......!

دوستی

فریب دینے کے لئے
دوستی ضروری ہے......
دھوکا......
اپنوں سے ہی کھایا جاتا ہے!

خودشناس

ہرشخص اپنا شناس
خود ہوتا ہے
قیمت اتنی کم نہ رکھو
کہ سب خریدار ہو جائیں!

اترن

عورتیں
اترن پہننے سے گھبراتی ہیں
دوسری عورتوں سے ذکر کرتے ہوئے شرماتی ہیں
مگر......
دوسری عورتوں کے شوہر چرا کر
اوڑھ لیتی ہیں!

تیسری اولاد

دن رات

میری تبدیلیِ جنس کی دعائیں مانگی گئیں

ماں باپ نے

بارہا آسمان کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھا

شاید خدا پہلے آسمان پر ہو

خدا آٹھویں آسمان پر تھا

دعائیں رستے میں رہ گئیں

منتیں، مرادیں، تعویذ، گنڈے

سب دغا دے گئے

میری جنس تبدیل نہ ہو سکی

باپ کی کمر اور جھک گئی

چہرے کی لکیریں مزید گہری ہو گئیں
ماں نے میلی سی چادر اور مضبوطی سے
سر پر اوڑھ لی
کیونکہ......
وہ تین بیٹیوں کی ماں بن چکی تھی!

تعلیم یافتہ

میرا بیٹا، بہت ہونہار
اعلیٰ تعلیم یافتہ
علم کی روشنی سے مالا مال
مجھے اس کے لئے ایسی عورت چاہیے
جو تعلیم یافتہ ہونے کے باوجود
جاہل ہو......
عقل و دانش رکھنے کے باوجود
کم فہم اور کم عقل ہو......
تجربہ کار اور ہوشیار ہونے کے باوجود
ناتجربہ کاری اور معصومیت کی ردا اوڑھ رکھے......
ذاتی نقطۂ نظر مفقود......

سوچنے سمجھنے کی صلاحیت سے محروم
تعلیم اس پر الزام ہو
ذہن میں تاریکیوں کا کہرام ہو
کیوں کہ......
مجھے اپنے بیٹے کے لئے
''بیوی چاہیے
استانی نہیں''......!

عورت کا گناہ

میرے گناہ کی عمر
کیوں اتنی طویل ہے!
میرے شریکِ گناہ نے
پیار کے نام پر......
میری عصمت کی چادر تار تار کی
کبھی نہ آنے والے کل کی امید پر
ایک گھر کے سپنے دکھا کر
امیدوں کے گلشن کو خاکستر کیا
وہ تو اپنا کام کر کے چلا گیا
مگر میرا گناہ......میرے پیٹ میں
آلتی پالتی مار کر کیوں بیٹھ گیا ہے!
میری کوکھ میں سڑاند کیوں!

میں ماں تو بننا چاہتی تھی

مگر......

اب میرا ماں بننا باعثِ عبرت ہے

میں ننگِ خاندان، حوّا کی بیٹی

سنگسار کیے جانے کے لائق

مگر......

اس گناہ کی سزا صرف مجھے کیوں!

اسے کیوں نہیں!

صرف اس لئے کہ

میرا گناہ ظاہر ہے

اور اس کا پوشیدہ......!

اس کا گناہ رات کی تاریکی میں تحلیل ہو گیا

اور میرا گناہ......

دن کے اُجالے میں ظاہر ہو گیا!

بدن سو گیا

مدتوں ظاہری آنکھیں کھلی رہیں
بدن جاگتا رہا
اندر کی آنکھیں کھلیں
تو روح جاگ اٹھی
اور بدن سو گیا......!

بخیل

مرد......

جو اپنی بیٹی سے بھی

محبت کے اظہار میں بخیل ہوتا ہے

یہ کیسے ممکن ہے

کسی دوسری عورت کو

بیٹی بنا لے......!

زیروبیس
(Zero Base)

ہمیں ضرورت ہے
ایک ایسی عورت کی......
جو ہمارے خاندان کے نام کو آگے بڑھائے
اندھیروں میں آس کے دیپ جلائے
ہمارے نورِنظر کی مونس وغم خوار ہو
اپنا سب کچھ قربان کرنے پر تیار ہو
شریکِ بستر ہو مگر شریکِ زندگی نہ ہو
ظاہری اور باطنی خوبیوں میں یکتا
مگر......
اس گھر کی دہلیز پار کرنے سے پہلے

اپنا علم، اپنی عقل، اپنا تجربہ
اپنی انا، اپنی خودداری، پسند و ناپسند
خودمختار ذہن، انفرادیت پسندی
اور ہاں......
اپنی زبان بھی
باہر ہی چھوڑ آئے
کیوں کہ......
اس گھر میں اسے زِیرو بیس سے سٹارٹ لینا ہوگا!

میں زندہ رہوں گی

میں زندہ رہوں گی
میری کوکھ سے پھوٹنے والی نرم و نازک کونپلیں
ایک دن تناور درخت بنیں گی
ان کی شاخوں پر پرندے پیار کے گیت گائیں گے
ان کے سائے میں تھکے ہار مسافر آرام پائیں گے
میں اپنے خالق کی محبتوں کی سفیر ہوں
میں سمجھ میں نہ آنے والے جذبوں کی تصویر ہوں
جو کبھی نہ مٹ سکے، میں وہ تحریر ہوں
میں گھروں کی تقدیر ہوں
جب تک اس زمین کی آغوش میں گھر موجود ہیں
میں زندہ رہوں گی
پائندہ رہوں گی!

نوزائیدہ خواب

میں ایک طویل نیند سے
جاگ اٹھی ہوں……
مقدر کو شاید ابھی اور سونا ہے
وہ کروٹ بدل کر سو گیا ہے
اس کروٹ بدلنے میں……
میرا بہت کچھ کھو گیا ہے
پیشانی کی روشن لکیریں……
ان میں ٹمٹماتے ستارے……
ستاروں میں خواہشوں کے گھروندے……
گھروندوں میں نوزائیدہ خواب……
جیسے گھونسلوں میں چڑیا کے نوزائیدہ بچے
بند آنکھیں……

کانپتی چونچیں......

بے بال وپر......

نحیف ونزار......

ماں کی نرم گرم آغوش پانے کے لئے بے چین

میرے نوزائیدہ خوابوں کو ڈھونڈ کر لاؤ

کیونکہ......

میری آنکھ کی گود ویران ہوگئی ہے......!

قتل کا لائسنس

تم بہادر ہو
بہت انصاف پسند
بہت غیرت مند
لیکن......
قتل کرنے کے لئے
کیا تمھیں عورت ہی ملتی ہے
کبھی جذبوں......
کبھی آرزوؤں......
کبھی ارمانوں......
کبھی سپنوں کا قتل......
اس پر بھی تمھارا جی نہ بھرے تو
جسموں کا قتل، غیرت کے نام پر......

شاید......

تم عورت کی پیدائش سے ہی
اس بدنصیب لمحے کو تلاش کرتے ہو
جب اس سے
کوئی لغزش، کوئی بھول
کوئی حماقت، کوئی انہونی
کوئی خطا سرزد ہو جائے
تاکہ تم قتل کا جواز پیش کر سکو
تم جس خدا، جس رسول
جس کتاب کو مانتے ہو
کیا انھوں نے تمھیں......
عورتوں کے قتل کا لائسنس جاری کیا ہے......!

نئی زمین

نکاح کے دو بول......
مرد اور عورت کے جسمانی ملاپ کا لائسنس!
نئے رشتوں کی زنجیر میں جکڑی عورت
فرائض کی گٹھڑی سر پر لادے
نئی زمین، نیا پودا
کسی نے سوچا......
اس پودے کے لئے نئی زمین کی آب وہوا
کتنی موافق ہے......!
وہاں کی ہوائیں کتنی مہربان ہیں
محبتوں کے موسم
پیار کے کتنے نئے پھول کھلاتے ہیں!
یا پھر تند و تیز ہوائیں اس پودے کو
زمین میں جڑ پکڑنے سے پہلے ہی
اکھاڑ کر پھینک دیتی ہیں!

بیوہ

سوگوار بیوہ نے
خزاں رسیدہ گلشن سے کہا
"تمھاری خزاں عارضی ہے
میری بربادی مستقل
بہار آئے گی
مُردہ پودے جی اٹھیں گے
مجھ بیوہ کو
کوئی موسم سہاگن نہ بنا سکے گا!"

اگر......

اگر سورج کی آنکھ کا نور
دہکتا ہوا لاوا بن کر
زمین و آسمان کو جلا ڈالے
درختوں کی جگہ انسان اگنے لگیں
کوکھ فصلیں دینے لگے
دنیا فاقہ زدہ ہو جائے
ساری زمین قبر بن جائے
کیا تم مجھے اس وقت بھی
پیار کرو گے!

خوشی

خوشی!

بدصورت پاؤں والا وہ پرندہ ہے
جو ناچتے ناچتے اپنے پاؤں دیکھ کر
اداس ہو جاتا ہے
اور ناچنا چھوڑ کر
کونے میں جا بیٹھتا ہے
جہاں غم دوستی کا ہاتھ پھیلائے منتظر ہوتا ہے!

زباں خاموش رہتی ہے

وہ کہا کرتا تھا
''زبان خاموش ہو
تو آنکھیں گفتگو کرتی ہیں!''
اب میں اس سے کیسے پوچھوں
کہ مرنے والوں کی آنکھیں
گفتگو کیوں نہیں کرتیں......!

سیپ کا دُکھ

میں ایک دن ساحلِ خیال پر جانکلی
حدِ نظر تک ریت کا بسیرا تھا
مگر......
ریت پر کہیں کہیں قدموں کے نشان تھے
یوں لگا کہ یہ کسی کے
قدموں کے نشان نہیں
بلکہ محبت کے ٹوٹے ہوئے گھروندے ہیں
ناکام و نامراد لوگوں کی
آرزوؤں کے بے چھت گھر
جنھوں نے کبھی سمندر کو گواہ بنا کر
زندگی بھر ساتھ نبھانے کی قسمیں کھائیں

انہی سوچوں میں غلطاں میرے پاؤں
ساحل پر بکھری ہوئی سیپیوں سے جا ٹکرائے
جو ایک نئی کہانی سنا رہی تھیں
بن موتیوں کی خاموش اور افسردہ
اجڑی ہوئی سیپیاں دیکھ کر مجھے خیال آیا
وہ ہاتھ کیسے ہوں گے
جنھوں نے ان سے موتی نکالے ہوں گے!
کیا وہ مہربان ہاتھ تھے
یا......
نامہربان ہاتھوں نے ان کی کوکھ اجاڑی
کئی منظر، کئی چہرے
کئی آنکھیں، کئی ہاتھ
میرے تصور میں آتے جاتے رہے
مگر سب تصویریں نامکمل
میری اس کیفیت کو دیکھ کر
ساحل کی آوارہ ہوائیں

ایک پل کے لئے رک گئیں
اور مسکراتے ہوئے یہ کہتے گزر گئیں

نادان......

سیپ سے موتی کے بچھڑنے کا دُکھ
معلوم کرنے آئی ہے......!

تشنہ لب

یہ میرا وجود نہیں
ایک دھرم شالا ہے
جس میں کتنی مجبور اور لاچار
حالت سے ڈری سہمی ہوئی
عورتیں......
مائیں، بہنیں
بیٹیاں، بیویاں
سب نے پناہ لے رکھی ہے
ان کے دکھوں کی داستان طویل ہے
ان کے لبوں پر بے بسی کے ترانے ہیں
ان کے ماتھے پر کئی ناموں کے الزام ہیں

گلے میں کتنے رشتوں کی پھانس
یہ نوحہ کناں عورتیں
اپنے کبھی نہ ختم ہونے والے
دُکھوں کی صلیب اٹھائے
دن رات بین کرتی رہتی ہیں
انھوں نے میرے وجود کو
کربلا بنا رکھا ہے
انھوں نے اشکوں کی سبیل لگا رکھی ہے
اتنے آنسو پی کر بھی
ان کی پیاس نہیں بجھتی
یہ کیسی تشنہ لبی ان کا مقدر بن گئی ہے......!

بِن بیاہی

گرہستی کا سُکھ

ہر عورت کے نصیب میں کہاں......

بِن بیاہی بوڑھیاں جس گھر میں ہوں

وہاں نہ در نہ دریچہ

نہ چھت کا سائباں

نہ معصوم شرارتیں

نہ سرگوشیاں، نہ قہقہے

نہ رات کی بے آرامی

نہ دن کی تھکاوٹ

وقت ہی وقت، بہت سا وقت

اور......

یہ اس کے دھارے میں
بہتی ہی چلی جاتی ہیں
ایک دن بے نیل ومرام
وقت کے سمندر میں جا گرتی ہیں

عورت امر ہے

وہ مجھے قتل کرنے آیا
مگر میں اسے محبت پاش نظروں سے دیکھ رہی تھی
جیسے وہ میرے لئے زندگی کی نوید لایا ہو
میری اس ادا پر اُس کے قدم لاکھڑا سے گئے
پھر بھی اس نے ساری توانائیاں سمیٹ کر
مجھ پر وار کیا
میرا وجود ٹکڑے ٹکڑے ہو گیا
ہر ٹکڑے پر ایثار و قربانی کی مہر تھی
وفاؤں کا پیغام تھا
اس عجیب صورتِ حال سے گھبرا کر

وہ......

خون آلودہ ہاتھوں سے باہر نکل گیا
میں اپنے وجود کے بکھرے ہوئے ٹکڑے سمیٹنے لگی
تا کہ اسے بتا سکوں
کہ عورت افسانہ نہیں، حقیقت ہے
جو بدل نہیں سکتی، مِٹ نہیں سکتی
مر نہیں سکتی، فنا نہیں ہو سکتی
وہ کسی نہ کسی روپ میں زندہ رہے گی
کیوں کہ......
''عورت امر ہے''

یک طرفہ محبتیں

کہتے ہیں
محبت دوطرفہ عمل ہے
مگر......
میری سب محبتیں یک طرفہ تھیں
جنھیں میں نے چاہا
وہ کسی اور در کے اسیر تھے
جنھوں نے مجھے چاہا
وہ میرے دل وذہن پر
کوئی نقش نہ چھوڑ سکے
مگر......
یک طرفہ محبتیں بھی
جواب مانگتی ہیں، حساب مانگتی ہیں

آنسوؤں کا، آہوں کا
خواہشوں کا، حسرتوں کا
بے نور صبحوں اور تاریک راتوں کا
ٹوٹتی انگڑائیوں اور کرچی کرچی خوابوں کا
مگر......
جواب کون دے گا!
حساب کون دے گا!
جب کہ کسی نے سوال ہی نہ سنا ہو!

کتابِ زندگی

کبھی میں بہت شوق سے کتابیں پڑھتی
کتابوں میں پھول اور تتلیاں رکھتی
رنگوں کو قید کرتی......
ہنستی، مسکراتی اور رنگ بکھیرتی تھی
مگر زندگی کے اس کٹھن سفر میں
میں خود ہی کتاب بن گئی ہوں
جس میں رنگ برنگی یادیں قید ہیں
وقت نے زندگی کی تحریریں
میرے چہرے پر لکھ دی ہیں......!

آوازوں کا جنگل

یہ کیسا آوازوں کا جنگل ہے
ہر لمحہ یہ آوازیں قریب سے قریب تر ہو رہی ہیں
یہ آوازیں تو اس دنیا میں بسنے والے
انسانوں جیسی ہی لگتی ہیں
لیکن ان کے حلیے کسی اور دنیا کی مخلوق جیسے ہیں
ظلم کی چادر ان کا لباس......
سروں پر بے صبری کی کلاہیں
پاؤں میں نفرت کے گھنگرو
ہاتھوں میں برہنہ شمشیریں
ان کی تند و تیز آوازیں
کسی برچھی کی طرح

میرے دل میں اتر رہی ہیں
ان کے حرفوں میں زہر ہے
ان کے لفظوں میں قہر ہے
خدا نہ کرے کہ یہ انسان ہوں......!

دردِزہ

اے دردِزہ!
تیری کوئی جنس کیوں نہیں ہے!
تو بیٹی کی پیدائش پر......
کوئی رعایت کیوں نہیں کرتا......!

صحرانورد

صحرا میرے قدموں سے لپٹ گیا ہے
جہاں جاتی ہوں، ریت میرا استقبال کرتی ہے
سوچ رہی ہوں
کہاں جاؤں......!

بانجھ

کتنی بانجھ عورتیں
بچہ نہ ہونے کے جرم میں
گھروں کی چاردیواری سے......
باہر دھکیل دی جاتی ہیں
بچے تو مرد کا نصیب ہیں
مگر یہ بات مردوں کو سمجھ کیوں نہیں آتی
شاید سمجھ میں آتی ہوگی
مگر......
لوگ جان کر بھی اَنجان بن جاتے ہیں!

غوطہ خور

اس نے میرے سامنے
آنسوؤں کے سمندر رکھ دیئے
میں کہاں کی غوطہ خور تھی
کہ خزانے تلاش کر لیتی......!

وقت

وقت کی دلھن
ماضی، حال، مستقبل
سب کی سیج......
سجاتے سجاتے ہلکان ہو جاتی ہے
لمحے
دن
مہینے
سال
صدیاں
سولہ سنگھار کر کے آتے ہیں
مگر......
اجڑی مانگ لے کر واپس چلے جاتے ہیں

میں کون ہوں

ٹائم!
اسپیس!
سب بے معنی ہو چکے ہیں
میں سب میں زندہ ہوں
کسی میں بھی زندہ نہیں ہوں
آدھی عورت......
آدھی مچھلی بن کر......
گہرے پانیوں میں غوطے لگانا
میرا مقدر ہے
تھک جاؤں
تو بادلوں میں پناہ لے لیتی ہوں
اور بارش کا قطرہ بن کر

زمین پر گر جاتی ہوں
قطرے سے دھرتی کہاں سیراب ہوتی ہے
میری پیاس......
دھرتی کی پیاس کو اور بڑھا دیتی ہے......!

مہربان گلیاں

میرے گاؤں کی گلیاں
جہاں چاندنی راتوں میں
نور کی برسات ہوتی تھی
سکھیاں سہیلیاں
میرے ساتھ ہوتی تھیں
جیسے آسمان پر تاروں کی بارات ہوتی تھی
گاؤں کی مٹی بھری گلیاں
میرے پاؤں چوم کر
پیار سے کہتیں
آہستہ چلو، ٹھوکر لگے گی
گر جاؤ گی، چوٹ آئے گی
درد ہوگا تو ہم سے برداشت نہ ہوگا

ماں کی طرح مہربان گلیاں
کتنی سچی تھیں، کتنی اچھی تھیں
کیوں کہ......
آج میں اپنی بیٹی سے کہتی ہوں
آہستہ چلو، گر جاؤ گی
گرے ہوؤں کو کوئی نہیں اٹھاتا
چوٹ لگی تو درد ہوگا
درد کا مداوا کوئی نہیں کرتا......!

اُدھورا پن

کچی عمروں میں محبتوں کے روگ پال کر
ادھورے پن کے ساتھ
جوانی کی دہلیز پر قدم مت رکھنا
بچھڑ جانے والوں کی یاد میں
کسی موہوم سی امید پر
دل کی کھڑکیاں اور دروازے
کھول کر انتظار مت کرنا
یہ ادھورے تجربے، یہ نامکمل پرچھائیاں
تمھیں جنسِ مخالف سے کہیں بدگمان نہ کردیں
منزل کا تعین کیے بغیر سفر پر نکلنے والے
رستوں کی دھول بن جایا کرتے ہیں
سچ بتاؤ!
کولمبس نے تو خوش قسمتی سے امریکہ دریافت کرلیا
مگر تم کس برِ اعظم کی تلاش میں ہو......!

چوتھا موسم

میں کئی برسوں سے گھر کے صحن میں
برگد کے بوڑھے درخت کو دیکھ رہی ہوں
گرمی، سردی، خزاں، بہار
چاروں موسموں میں یہ رنگ بدلتا ہے
مجھے یہ درخت بھی ایک عورت دکھائی دیتا ہے
جس کی زندگی میں
بچپن، جوانی اور بڑھاپے کے موسم آتے ہیں
اس درخت کے چاروں موسم تو گزر جاتے ہیں
مگر عورت کی زندگی میں چوتھا موسم
موسمِ تنہائی بن کر......
اکثر ٹھہر جاتا ہے......!

مجھے بولنا کیوں سکھایا

گوتم بدھ کی طرح
میرے چہرے پر تفکر کی جو لکیریں ہیں
یہ ماہ و سال کا قصہ نہیں
یہ تو صدیوں کی کہانی ہے
جو برہنہ پا
بہت کٹھن راستوں پر سفر کرتی ہوئی
ان منزلوں سے آئی ہے
جہاں جذبوں نے لفظوں سے آشنائی کی
حالِ دل کہنے کے لئے
ہونٹوں نے جنبش کرنا سیکھا
زبان نے رقص کے نئے انداز سیکھے
مگر......

زبان بندی کا حکم صادر ہو گیا
درد کا کانٹا روح میں اتر کر
غم کی ایک باڑھ میرے اندر اُگا گیا
میں دُکھ کی ہری بھری پگڈنڈی پر کھڑی سوچ رہی ہوں
اگر میں دل کی بات نہیں کہہ سکتی
تو......
''مجھے بولنا ہی کیوں سکھایا......!''

تم میرا حصہ بھی لے لو

میرے وجود میں......
درد کے پیڑ اُگ رہے ہیں
نوکیلے پتّے......
ریشمی وجود کو چھلنی کیے دیتے ہیں
میری نامراد کوکھ سے......
جھانکتی ہوئی دو آنکھیں......
جن کی زرخیز نمو کے سارے امکانات
دم توڑ چکے ہیں
میری ممتا......شرمسار ہو کر منہ چھپا رہی ہے
آہ......
درد کی جاگیر کا......
کچھ زیادہ ہی حصہ مجھے مل گیا ہے
تم میرا حصہ بھی لے لو......!

اُجالا

پاکیزہ محبتوں سے محرومی نے
میرے اندر اندھیرے بھر دیئے
زندگی کی راہ تلاش کرتے کرتے
میں گہرے سمندروں میں جا گری
منہ زور سمندروں نے مجھے
پوری رعونت سے
ساحلوں کی طرف دھکیل دیا
زندگی منتظر ملی......!
لہروں نے سلامی دی!
میری بیٹی کے ایڑیاں رگڑنے سے
مقدس زمزم کے چشمے پھوٹ نکلے

ممتا کی لازوال محبت کے چشمے
اندھیرے اُجالے بن گئے
پیاس بجھ گئی......
میں کائنات کی......
مقدس ترین ہستی بن چکی تھی
''ماں......!''

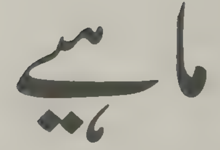
پورا خواب

موجۂ گل نے نوید دی......
خوابوں کی تکمیل کا موسم آ گیا
میرے خواب......
عورت کے خواب......
ماں کے خواب......
سب آپس میں مدغم
لمحہ لمحہ......
آنکھوں سے ٹپک ٹپک کر
نہ جانے کب......
میری بیٹیوں کی آنکھوں میں منتقل ہو گئے
قندیلوں سی روشن آنکھیں......
جذبوں کی چمک......

پُر تقدیس اور پُر عزم چہرے
آنکھوں میں گلاب کی پنکھڑیوں کی مانند
کومل کومل کھلتے ہوئے خواب

اور......

کہیں دُور سے آتی ہوئی صدا......
''بیٹے اگر باپ کے نسب کے وارث ہیں
تو بیٹیاں......
ماؤں کے خوابوں کی امین ہوتی ہیں''......!


ماہیے

حسنِ ترتیب

میرے ماہیے...... میرے دوہے

ماہیے اور دوہے لکھنے کی داستان بھی خاصی دل چسپ ہے۔ یہ کم وبیش کوئی چودہ پندرہ برس قبل کی بات ہے کہ میں برمنگھم میں مقیم نامور بزرگ صحافی اور ''کشمیر اداس ہے'' اور ''نگارشاتِ محمود ہاشمی'' کے مصنف جناب محمود ہاشمی کی ذاتی لائبریری سے اکثر وبیش تر استفادہ کرتی رہتی تھی۔ جس سے مجھے بہت سی ایسی نادر کتب پڑھنے کا موقعہ ملا جو کہ برطانیہ کی لائبریریوں میں دستیاب نہیں تھیں۔

یوں ہی ایک دن یکسانیت سے اکتا کر میں کسی دل چسپ کتاب کی تلاش میں ہاشمی صاحب کی لائبریری تک جا پہنچی تو انھوں نے بتایا کہ آج کل ''ماہیا'' میدان جنگ بنا ہوا ہے۔ میں کچھ سمجھ نہ پائی تو انھوں نے وضاحت کی کہ جرمنی میں مقیم نامور شاعر اور ادیب حیدر قریشی اور پشاور سے ''ابلاغ'' رسالہ نکالنے والی سیّدہ حنا کے درمیان گھمسان کا رَن پڑا ہوا ہے۔ اور ماہیوں کے اوزان کی بحث اب گھر سے نکل کر چوباروں چڑھ گئی ہے۔ ہاشمی صاحب نے سلسلۂ کلام جاری رکھتے ہوئے کہا کہ میرے خیال میں تو آپ دونوں کی ماہیوں کی کتابیں لے جائیں اور خود پڑھ کر فیصلہ کریں کہ اُردو ماہیا کس وزن پر لکھا جانا چاہیے۔ اور اگر کچھ تحریک پیدا ہو تو پھر اس میدان میں طبع آزمائی بھی کریں۔

سچ مانیے تو مجھے ہاشمی صاحب کی شگفتہ بیانی، زیرِ لب مسکرانا، ماہیے کی طول پکڑتی ہوئی بحث، سیّدہ حنا کے دلائل اور حیدر قریشی صاحب کے دلائل در دلائل اور ماہیے کے وزن کا

جھگڑا بہت دل چسپ معلوم ہوئے۔ میں ماہیوں کے دونوں کتابیں پڑھنے کے لئے لے آئی مگراس کے ساتھ ہی میں نے ہاشمی صاحب سے کہا کہ یہ دونوں کتابیں تو میں آپ کی تجویز پر لے کر جا رہی ہوں مگر جمیل الدین عالی کی دوہوں کی کتاب بھی مجھے ضروری چاہیے۔

بہر حال جلد واپسی کے وعدے پر تینوں کتابیں ان سے لے کر آ گئی اور آتے ہوئے بڑی احتیاط سے انھوں نے میرے دستخط (بقلم خود) اپنے بُک بنک (Bookbank) کے کھاتے میں لے لئے تاکہ سند رہے۔ اب بات چل نکلی ہے تو اتنا ضرور کہے دیتی ہوں کہ ہاشمی صاحب کتاب کے معاملے میں کسی پر کم ہی اعتبار کرتے تھے مگر میری کتابی دیانت داری سے متاثر ہو کر اکثر وبیش تر مجھے کتابیں عنایت کر دیا کرتے اور ساتھ ہی کہتے کہ ''آپ ہمیشہ کتاب وقت پر واپس کرتی آئی ہیں وگرنہ تو لوگ کتاب ہضم کر جاتے ہیں اور ڈکار بھی نہیں مارتے۔''

میں جب بھی ان کی شیلفوں پر سجی کتابوں کو الٹ پلٹ کر دیکھتی تو اس عرصے میں ہاشمی صاحب کافی مضطرب سے نظر آتے۔ جیسے ہی کسی کتاب کو ہاتھ لگاتی تو ساتھ ہی شاہی فرمان نازل ہو جاتا کہ آپ اس کی جگہ بالکل تبدیل نہ کریں اور بس دیکھ کر واپس رکھ دیں۔ کیوں کہ میں نے ان سب کو اپنے حساب سے رکھا ہوا ہے۔ کچھ کتابیں میری تنظیم ''آ گہی'' کی لائبریری کے لئے بھی عنایت کیں اور ایک کتاب بطور خاص محترمہ فاطمہ جناح کے بارے میں دیتے ہوئے کہا کہ آپ جیسی خواتین کو ایسی کتابیں پڑھنا چاہییں۔ وہاں بہت سی اور تاریخی ادبی تحریریں مجھے دیکھنے کو ملیں جن میں قدرت اللہ شہاب اور ممتاز مفتی کے خطوط قابلِ ذکر ہیں۔

میں سمجھتی ہوں کہ ان کا یہ کہنا اور کتابیں نہایت شفقت سے پڑھنے کے لئے دینا میرے لئے ایک اعزاز کی بات تھی۔ بات کہاں سے کہاں جا نکلی۔ بہر حال دونوں کتابیں پڑھنے کے بعد مجھے خود بھی ماہیے لکھنے کی تحریک پیدا ہوئی مگر حیدر قریشی کے اُردو ماہیے مجھے

پنجابی ماہیے کے وزن پر زیادہ درست معلوم ہوئے۔ کیوں کہ پنجابی ماہیے (ٹپّے) کی لے سے میرے کان بچپن سے آشنا تھے اس لئے اس وزن میں ماہیے لکھنے میں مجھے کوئی دِقّت محسوس نہیں ہوئی۔ اور ایک نہایت فطری انداز میں ماہیے خود کو لکھواتے رہے۔

حیدر قریشی اس سلسلے میں خود رقم طراز ہیں کہ ''ماہیا نگاری کے سلسلے میں مجھے خوشی ہے کہ اُردو ماہیے کو پنجابی ماہیے کے وزن اور مزاج کے مطابق کرنے میں بنیادی نوعیت کا کام کرنے کا موقعہ ملا۔ میں نے پنجابی ماہیے کے وزن کو ملحوظ رکھتے ہوئے اُردو ماہیے کہے ہیں اور اس میں موضوعاتی لحاظ سے لکھنے کے نئے تجربے کیے ہیں۔''

غرض کہ ماہیے کی دل چسپ بحث نے مجھے بھی ماہیا نگار بنا کر ہی چھوڑا۔ اور صرف چند ہفتوں کے اندر میں نے مختلف موضوعات پر کوئی تین سو کے قریب ماہیے لکھ ڈالے۔ میں جب ہاشمی صاحب کو کتابیں واپس کرنے گئی تو ساتھ ہی ماہیوں کا مسودہ بھی لے گئی جس سے انھیں بڑی خوش گوار حیرت ہوئی اور کہنے لگے کہ آپ کے اس تخلیقی کام سے جرمنی میں حیدر قریشی یقیناً بہت خوش ہوں گے۔ کیوں کہ آپ نے ان کے تجویز کردہ وزن میں ماہیے لکھ کر ان کی ماہیے کی تحریک کو تقویت پہنچائی ہے۔ بعد میں انھوں نے میرا قریشی صاحب سے فون پر تعارف کروایا۔ حیدر قریشی نے بعد ازاں میرے ماہیوں کے مجموعے کا پیش لفظ بھی لکھا۔ اس طرح سے میں یورپ میں (بھارت، پاکستان کے بارے میں علم نہیں) پہلی ماہیا نگار صاحبِ کتاب خاتون قرار پائی۔ میری ماہیوں کی کتاب ''پیپل کی چھاؤں میں'' ۲۰۰۱ء کے آغاز میں زیورِ طباعت سے آراستہ ہوئی۔

جہاں تک دوہوں کا تعلق ہے، تو عالؔی صاحب کے دوہے پڑھنے کے بعد میں نے کوئی ایک سو کے قریب دوہے بھی لکھ لیے اور بعد میں کہیں گم کر بیٹھی۔ مگر دس بارہ برس کے بعد جب گھر تبدیل کیا تو دوہے دوبارہ دریافت ہو گئے۔ اُن کی نوک پلک درست کر کے میں نے جرمنی میں حیدر قریشی صاحب سے رابطہ کیا کہ دوہوں کے بارے میں اپنی رائے

سے مطلع کریں مبادا پھر سے گم شدہ ہو جائیں۔ ان کی طرف سے حوصلہ افزائی پر میں نے تمیں کے قریب دوہے ان کے ششماہی جریدے ''جدید ادب'' کے لئے روانہ کر دیئے جو جنوری ۲۰۱۲ء کے شمارہ نمبر ۱۸ میں شائع کر دیئے گئے۔ گویا ایک طرح سے ''جدید ادب'' نے میرے دوہوں کی رسمِ اجراء کر دی ہے۔

ڈاکٹر رضیہ اسماعیل
برمنگھم
۱۲ جنوری ۲۰۱۲ء

حمدیہ ماہیے

کعبے میں اذان ہوئی
سر میرا سجدے میں
تیرے گھر مہمان ہوئی

تو باغ کا مالی ہے
تیری رحمت کا
جگ سارا سوالی ہے

اک تھال ہے سونے کا
چڑیاں بول اٹھیں
نہیں وقت یہ سونے کا

آنکھوں میں ہے دم میرا
کلمے کی برکت سے
سب دُور ہو غم میرا

اک قبر اندھیری ہے
اپنا مقدر تو
مٹّی کی ڈھیری ہے

ساحل ہے، سمندر ہے
یاد کرو ربّ کو
ربّ دل کے اندر ہے

گندم کا دانہ ہے
چھوٹ گئی جنت
یہ قصہ پرانا ہے

دریا میں سفینہ ہے
ماہِ رمضاں تو
بخشش کا مہینہ ہے

معراج کی رات آئی
جھولیاں بھر لو تم
ربّ کی سوغات آئی

کب خلقت ہوش میں ہے
مانگنا آتا نہیں
تِری رحمت جوش میں ہے

زنجیر ہے رشتوں کی
یہ معراج کی شب
ہے عید فرشتوں کی

چڑھے تیر کمانوں میں
نام تیرا باقی
رہے دونوں جہانوں میں

نعتیہ ماہیے

گلشن میں نظارے ہیں
چاند نبیؐ اپنا
اور باقی ستارے ہیں

اے بادِ صبا جانا
خوشبو مدینے کی
تھوڑی سی چرا لانا

پانی کا دھارا ہے
تیری محبت نے
میرا بخت سنوارا ہے

اک کملی کالی ہے
شان محمدؐ کی
سب جگ سے نرالی ہے

اک چہرہ ہے نورانی
چاند ستاروں سی
ہے روشن پیشانی

ربّ کے احکام ہوئے
آقاؐ آپؐ کے ہم
بے دام غلام ہوئے

فرمان وہؐ لے آیا
سینے میں رکھ کر
قرآن وہؐ لے آیا

اک حبشی بلالؓ ہوا
حبِّ نبیؐ میں وہ
ذرہ تھا، کمال ہوا

جاتی ہوں مدینے کو
پار لگائے گا
کیا ڈر ہے سفینے کو

بستی ہے مزاروں کی
دل سے دعا نکلے
ہو خیر پیاروں کی

اک شاخ انجیر کی ہے
رشتہ مدینے سے
صورت زنجیر کی ہے

اسلام کو عام کیا
اپنا نبیؐ وہ ہے
جسے ربّ نے سلام کیا

ہمیں تیرے سہارے ہیں
پیاس بجھا دینا
کوثر کے کنارے ہیں

بڑی اونچی اڑانیں ہیں
مسجدِ نبویؐ کی
یاد آتی اذانیں ہیں

روضے کی جالی ہے
گنبدِ خضرا ہے
کونین کا والی ہے

پتوار سفینے کی
کتنی معطّر ہیں
یہ گلیاں مدینے کی

جو ربّ کے پیارے تھے
طائف والوں نے
انھیں پتھر مارے تھے

اک باغ مدینے کا
تیری دید بنا
کیا لطف ہے جینے کا

بڑے دُکھ سُکھ ہوتے ہیں
تیرے پہلو میں
تیرے یار بھی سوتے ہیں

رحمت کی گھٹائیں ہیں
شہرِ مدینہ کی
پاکیزہ فضائیں ہیں

تو آمنہ جایا ہے
بی بی حلیمہ نے
تجھے دودھ پلایا ہے

دو فاطمہؓ جائے تھے
تو نے محبت سے
کاندھوں پہ بٹھائے تھے

سوتے میں جگایا تھا
ربّ نے محمدؐ کو
عرشوں پہ بلایا تھا

ہمیں کیوں نہ یقیں آئے
لینے محمدؐ کو
جبریلِ امیں آئے

شہیدانِ کربلا کی یاد میں

اشکوں سے وضو کر کے
ماہیے لکھتی ہوں
میں دل کو لہو کر کے

پانی کی جھیلیں ہیں
قطرہ نہ ان کو ملا
اب لگتی سبیلیں ہیں

گھوڑوں کا دانہ تھا
شمر کے تیروں کا
بس تو ہی نشانہ تھا

تو فاطمہؓ جایا ہے
کوفے والوں کو
ذرا رحم نہ آیا ہے

کہیں خیمے جلتے ہیں
قتل کریں خود ہی
پھر ہاتھ بھی ملتے ہیں

یوں تیر جو کستے ہو
کون نشانہ ہے
تم کس پہ برستے ہو

بڑی سخت چٹانیں تھیں
پیاس سے بچوں کی
جب لب پر جانیں تھیں

سادات گھرانا ہے
ظلم یوں ڈھاتے ہو
کیا قرض پرانا ہے

بہتا ہے فرات کہیں
پیاسے ہی مار دیئے
نہیں اس کی نجات کہیں

اک شورِ قیامت ہے
مٹّی کربل کی
آنسو ہے، ندامت ہے

کوئی بھوکا پیاسا تھا
نیزے پہ سر جس کا
وہ تیراؐ نواسا تھا

کیسی بربادیاں تھیں
ننگے سر جن کے
وہ سیّد زادیاں تھیں

یہ درد ہمارے ہیں
پانی کے قطرے کو
ترسے ترے پیارے ہیں

وہ سب کو پکار آئی
پانی کے بدلے میں
تیروں کی بوچھاڑ آئی

کچھ قرض ہمارا تھا
داد رسی کرتے
زینبؓ نے پکارا تھا

پانی کا سوالی ہے
نانا نبیؐ جس کا
کوثر کا والی ہے

باطل سے نہ ڈرتا تھا
سر تھا نیزے پر
قرآن وہ پڑھتا تھا

وہ جیت کے ہار گئے
تیر چلائے جو
انھیں خود ہی مار گئے

جب غم کی گھٹا چھائی
پیٹتی سر اپنا
کربل کی قضا آئی

یہ کیسی شقاوت ہے
فوجِ یزیدی پر
لعنت ہے، ملامت ہے

کربل میں چلی آندھی
چادریں سر سے اُڑیں
بربادی ہے بربادی!

باطل سے لڑائی تھی
سانچ کو آنچ نہیں
فتح حق نے پائی تھی

گھر اتنا بھی دُور نہ تھا
حق کے پرچم کا
جھکنا منظور نہ تھا

ہوا خون امیدوں کا
سہرا لکھتی ہوں
کربل کے شہیدوں کا

وہ فاطمہؓ کا جایا
خاک پہ سجدہ کیا
جب وقتِ نماز آیا

دیا خون کا نذرانہ
نانا کی امت کی
غلطی کا تھا ہرجانہ

سب فرق مٹا ڈالا
دِین تھا نانا کا
گھر بار لٹا ڈالا

ہمیں قرض چکانا ہے
پانی کے بدلے میں
اب خون بہانا ہے

عمروں کا رونا ہے
اپنے اشکوں سے
ہمیں داغ یہ دھونا ہے

قرآں کے سیپارے ہیں
اپنے گناہوں کے
دینے کفارے ہیں

سب اپنے پرائے تھے
کوفے والوں نے
کیا زخم لگائے تھے

کسی ہاتھ کی ریکھا ہے
نانا نے خود آ کر
تیرا حال بھی دیکھا ہے

اک ہیرا کھویا تھا
تیری شہادت پر
دشمن بھی رویا تھا

اب کس لئے روتے ہیں
خاک پہ کربل کی
شہزادے سوتے ہیں

بہے خون وریدوں سے
شان ہے جنت کی
کربل کے شہیدوں سے

کیکر پہ پھول ہوا
خون شہیدوں کا
عرشوں پہ قبول ہوا

غازی علم دین شہیدؒ کی یاد میں

ہر سمت اُجالا تھا
قبر تھی غازی کی
اک نور کا ہالہ تھا

پھانسی کا پھندا تھا
دنیا کیا جانے
یہ عشق کا دھندا تھا

جس در کے مرید ہوئے
اس کی محبت میں
غازی سے شہید ہوئے

قسمت کا دھنی غازی
ہار کے جاں اپنی
وہ جیت گیا بازی

تیرا بخت سنوار دیا
آقاؐ نے ہاتھوں میں
تُربت میں اُتار دیا

قدرت کے اشارے ہیں
غازی کے مرقد پر
رحمت کے نظارے ہیں

بچپن یا بڑھاپا ہے
غازی اللہ کا
پُر نور سراپا ہے

کبھی وقت بھی ٹھہرا ہے
غازی ! فرشتوں کا
تیری قبر پہ پہرا ہے

شیرینی ہے منّت کی
دلھن غازی کی
اک حور ہے جنت کی

ماہر تھا بڑا غازی
نکل گیا آگے
اور جیت گیا بازی

جو ہنستا ہے، روتا ہے
نگری داتا کی
یہاں غازی سوتا ہے

ترِی قبر میانی میں
سولی لٹک گیا
تو عین جوانی میں

آرام سے سوتے ہیں
قبر میں آقاؐ کے
دیدار بھی ہوتے ہیں

خوں آنکھوں میں اشک ہوا
تیری قسمت پر
ہر ایک کو رشک ہوا

یہی کہتا ہے ہر قاضی
تیری شہادت پر
ربّ تجھ سے ہوا راضی

پنجاب رنگ

میں لہر چناب کی ہوں
غیرت بھائیوں کی
بیٹی پنجاب کی ہوں

اک لڑکی گاؤں میں
ماہیے لکھتی ہے
پیپل کی چھاؤں میں

گھی دیسی کھانوں میں
پل کے جوان ہوئی
ماہیے کی تانوں میں

بڑی چاندی راتیں تھیں
چھاؤں تھی تاروں کی
سکھیوں سے باتیں تھیں

کیا رُوپ نکالا تھا
تازہ مکھن تھا
لسّی کا پیالا تھا

دو دودھ کی دھاریں ہیں
سکھیاں بچھڑ گئیں
کونجیں ہیں نہ ڈاریں ہیں

زنجیر ہے پاؤں میں
دنیا دیکھ چکی
چل واپس گاؤں میں

اک نہر کنارہ ہے
گاؤں کا ہر ذرّہ
مجھے جان سے پیارا ہے

مٹّی میرے گاؤں کی
اس کو سلام کروں
نہیں دھول یہ پاؤں کی

کھیتوں میں کھلی سرسوں
اس ہرجائی نے
نہیں یاد کیا برسوں

اک لڑکی دوانی ہے
یاد اک بچپن کی
انمول نشانی ہے

ہم باغوں میں جاتے تھے
چھپ کر مالی سے
امرود چراتے تھے

فصلوں کی کٹائی ہے
ساگ پراٹھے ہیں
کہیں دودھ ملائی ہے

بیلوں کی جوڑی ہے
اس نے شرارت سے
میرے گاگر توڑی ہے

کہیں چاندنی چٹکی ہے
دنیا کہتی ہے
"گُڑی" رستہ بھٹکی ہے

گندم کی بالی ہے
آدھے گھر والی
بڑے نخرے والی ہے

کسی بات پہ بھڑکی ہوں
سمجھا ہے کیا تو نے
میں گاؤں کی لڑکی ہوں

بڑی لمبی جدائیاں ہیں
پانچ میرے بھائی
اور دو ماں جائیاں ہیں

عورت کی کہانی

بڑا ظلم کماتے ہو
عورت ماں بھی ہے
کیوں اُس کو رُلاتے ہو

عورت کو ستاؤ گے
جنم جلی ہے جو
کیا اس کو جلاؤ گے

کہیں چیت ہے، پھاگن ہے
جس کو پیا چاہے
بس وہ ہی سہاگن ہے

ہر سمت اُجالا ہے
میرے مقدر کا
اب تو ہی حوالہ ہے

بادل ہیں، گھٹائیں ہیں
میرا اثاثہ تو
ساجن کی وفائیں ہیں

اس جگ کا نور ہے ماں
ربّ کے بعد یہاں
دوجے ربّ کا ظہور ہے ماں

جنگل میں پرندے ہیں
ڈھانپ لو سر اپنا
ہر طرف درندے ہیں

شبنم کا قطرہ ہے
تنہا عورت کو
ہر طرف سے خطرہ ہے

ہاتھوں کی لکیریں ہیں
جوگیا! دیکھ ذرا
کیسی تحریریں ہیں

بادل ہے، بجلی ہے
پیار سے پکڑو ذرا
بڑی نازک تتلی ہے

میری ہیرے کی انگوٹھی
تیری نشانی ہے
لگتی ہے مگر جھوٹی

کمھار کا آوا ہے
پکتا رہتا ہے
میرے دل میں جو لاوا ہے

عورت کو دغا دو گے
بیوی بنا کر تم
چولھے میں جلا دو گے

یہ دیئے کی باتی ہے
قدر کرو اس کی
دکھ سکھ کی ساتھی ہے

دلھن شرماتی ہے
رات مرادوں کی
برسوں میں آتی ہے

تم ہاتھ اٹھا رکھنا
لوٹ ہی آئے گا
دروازہ کھلا رکھنا

مر مر کر جیتے ہیں
زہر جدائی کا
ہم روز ہی پیتے ہیں

عورت کی کہانی ہے
غور سے سننا تم
گو بات پرانی ہے

عورت کو ستاتے ہو
اک پل پیار کرو
اک پل میں رُلاتے ہو

سوہنی، نہ ہیر ہوئی
تیری محبت میں
تیرے گھر میں اسیر ہوئی

آنچل کو سنبھالا ہے
عورت کے دم سے
دنیا میں اُجالا ہے

چھوٹا سا گھر ہو گا
اپنی دعاؤں میں
کب جانے اثر ہو گا

مندر ہے، پجاری ہے
شان ہے مردوں کی
ناری تو بچاری ہے

دو چڑیاں آئی ہیں
کہتی ہیں مالی سے
ہم دونوں پرائی ہیں

کیا رِیت بنائی ہے
جس کو جنم دیا
وہی بیٹی پرائی ہے

پھولوں کی ڈالی ہے
مہندی لگے جس کو
وہی قسمت والی ہے

ہر طرف بلائیں تھیں
بچ کر نکل گئے
سب ماں کی دعائیں تھیں

ہائے کتنی گرمی ہے
چھاؤں ممتا کی
پھولوں سی نرمی ہے

سہرے کی لڑیاں ہیں
ماں صدقے واری
انمول یہ گھڑیاں ہیں

کہیں بجلی کڑکی ہے
آس لگا بیٹھی
نادان یہ لڑکی ہے

کسی جھیل میں بجرہ ہے
راہ تکوں بیٹھی
بالوں میں گجرا ہے

اک چڑیا اُڑتی ہے
شادی ہو گئی ہے
اب لڑکی کڑھتی ہے

روایتی ماہیے

دارا ہے، سکندر ہے
ڈوب گئی میں تو
یہ عشق سمندر ہے

مٹّی کا کھلونا ہے
رکھ لے کھٹالی میں
چن دل میرا سونا ہے

سب دکھ سکھ بانٹے ہیں
چُن دو ذرا ساجن
رستے میں کانٹے ہیں

تیری آنکھ کا تِل ماہیا
بڑا ہرجائی ہے
کبھی آن کے مِل ماہیا

خوشبو ہے گلابوں کی
رستے میں حائل ہے
دیوار حجابوں کی

پیڑوں کی قطاریں ہیں
پت جھڑ گزر گیا
جوبن پہ بہاریں ہیں

پنگھٹ پہ گوری ہے
نٹ کھٹ ماہیے نے
میری بانہہ مروڑی ہے

ترے پیار کی برکھا ہے
بھیگ گئی ساجن
تو ایسے برسا ہے

دیوار کا سایہ ہے
دیکھ کے شرمائی
میرا ماہیا آیا ہے

مجرم ہے، کٹہرا ہے
پیار تو کر بیٹھے
سارے جگ کا پہرا ہے

بارود کا گولہ ہے
اپنی محبت پر
جگ آگ بگولہ ہے

پربت ہے، بادل ہے
آ کہیں دُور چلیں
جگ راہ میں حائل ہے

مکڑی کا جالا ہے
جس پر دل آیا ہے
بڑا نخرے والا ہے

دریا میں کشتی ہے
اجڑ نہ جائے کہیں
یہ دل کی بستی ہے

ناگن بل کھاتی ہے
چنری ریشم کی
کیوں اُڑ اُڑ جاتی ہے

تالاب میں کائی ہے
چٹھی ساجن کی
بڑی دُور سے آئی ہے

یوں پیار نبھائیں گے
خونِ جگر سے ہم
اک تاج بنائیں گے

ہم لوٹ کے آئیں گے
گلشن یادوں کا
پھر سے مہکائیں گے

روتے، کبھی ہنستے ہیں
دل میں یادوں کے
جگنو سے چمکتے ہیں

اک محل ہے سپنوں کا
کھڑکی، نہ دروازہ
اب ڈر کیا اپنوں کا

دریاؤں میں طغیانی
بھول گئی رستہ
اک آنکھ تھی مستانی

کاٹیں گے جو بوئیں گے
وقت گنوایا تو
تا عمر ہی روئیں گے

تتلی کے رنگ ماہیا
شک مجھے ہوتا ہے
ترِے دیکھ کے ڈھنگ ماہیا

چاندی کے کنگن ہیں
کیسے ٹوٹیں گے
یہ دل کے بندھن ہیں

لکڑی کا پُل ماہیا
ایسی میں گھبرائی
گیا گھونگھٹ کُھل ماہیا

دریا کی روانی ہے
ٹھوکر کھائے گی
منہ زور جوانی ہے

بڑے لمبے سائے ہیں
ہم نے بلایا نہیں
وہ خود ہی آئے ہیں

جنگل میں جوگی ہیں
دنیا چھوڑ چکے
ہم دل کے روگی ہیں

چندا ہے، نہ تارے ہیں
شکل دکھا جاؤ
ہم ہجر کے مارے ہیں

پھولوں کی مہک ساجن
دل میں نہ جانے کیوں
ہوتی ہے کسک ساجن

کلی دل کی نہ کھِلتی ہے
بچھڑ گئے دونوں
کسے منزل ملتی ہے

ہم جیت کے ہار گئے
دنیا کی رسموں پر
جان اپنی وار گئے

کیوں آس لگا بیٹھے
دل کی نگری کا
ہم دیپ جلا بیٹھے

پتوں کی آہٹ ہے
کوئی نہیں آیا
پھر کیوں گھبراہٹ ہے

اک تارا ٹوٹا ہے
کیسے کہوں سکھیو
میرا ماہیا روٹھا ہے

بنجاروں کا ڈیرا ہے
ماضی گزر گیا
تیرا ہے نہ میرا ہے

یادوں کے خزانے ہیں
کیسے بھلاؤں گی
کچھ روگ پرانے ہیں

کہیں گھنگرو بجتے ہیں
پھول مزاروں کے
کہاں سیج پہ سجتے ہی

بڑا گہرا بادل ہے
آنسو نہ بہہ نکلیں
مِری آنکھ میں کاجل ہے

نینوں سے جام بھروں
نام ترا لے کے
آہیں صبح و شام بھروں

شہنائی بجتی ہے
تیرے بنا ساتھی
کہاں محفل سجتی ہے

لوہے کی ہیں زنجیریں
منہ کیوں موڑ لیا
کیا ہو گئیں تقصیریں

پاؤں میں پائل ہے
تانیں ٹوٹ گئیں
ہر نغمہ گھائل ہے

ماضی کی یادیں ہیں
بیکل رہتے ہیں
لب پر فریادیں ہیں

بستی میں سپیرے ہیں
اپنے مقدر میں
کیوں اتنے اندھیرے ہیں

کیا شکوہ نصیبوں سے
کرتے ہیں جاسوسی
عاجز ہیں رقیبوں سے

بستی میں ہیں بنجارے
جی کو جلاتے ہیں
تیری باتوں کے انگارے

کہیں پھول نہیں کِھلتے
آدمی تو ہیں مگر
انسان نہیں ملتے

اب تنہا رہنا ہے
حال ہمیں دل کا
اس سے نہیں کہنا ہے

کوئی مست قلندر ہے
غم کی لہر اٹھی
میرا دل تو سمندر ہے

کہیں بانسری بجتی ہے
دو دل دُور ہوئے
تقدیر بھی ہنستی ہے

بڑی کالی راتیں ہیں
نظر نہیں آتیں
تقدیر کی گھاتیں ہیں

کہیں قافلے جاتے ہیں
ناگ جدائی کے
اب مجھ کو ڈراتے ہیں

اک پٹڑی ریل کی ہے
بازی کب جیتا
کوئی پیار کے کھیل کی ہے

وطنِ عزیز کی یاد میں

کہیں پھول برستے ہیں
بچے غریبوں کے
روٹی کو ترستے ہیں

ندیا میں باڑ آئی
کوئی نہیں سنتا
میں سب کو پکار آئی

تعبیر ہے، سپنا ہے
ایسے نہ لُوٹو تم
یہ ملک تو اپنا ہے

میں قوم کا لیڈر ہوں
شیر نظر آؤں
اندر سے گیدڑ ہوں

غصے میں نہ آیا کرو
ڈھول سپاہیا تم
رشوت نہ کھایا کرو

سانگھڑ ہے نہ سکھر ہے
موج اُڑاتے ہیں
پی آر کا چکر ہے

ٹیکسوں کی چوری ہے
کرتے ہو ہڑتالیں
کیا سینہ زوری ہے

ہمیں فول بناتے ہو
انگلش اُردو الگ
اسکول بناتے ہو

روٹی ہے نہ پانی ہے
نوکری ملتی نہیں
اب ڈگری جلانی ہے

پیسہ ہے خدا اپنا
پیسے کے کارن ہی
ہوا صوبہ جدا اپنا

دریا کی موجیں ہیں
ڈر کیا دشمن کا
سرحد پر فوجیں ہیں

جنت کا نظارہ ہے
لے کے رہیں گے ہم
کشمیر ہمارا ہے

گندم کے دانے ہیں
پیسے والوں کے
کملے بھی سیانے ہیں

پالیٹکس میں آئیں گے
خالی جیبیں ہیں
بڑا مال بنائیں گے

مہنگائی نے مارا ہے
پانی ہی پی کر
اب کرنا گزارا ہے

بندر ہے، مداری ہے
روٹی کے چکر میں
دن رات خواری ہے

ننگے پاؤں چلتے ہیں
جرم غریبی کا
تیزاب میں جلتے ہیں

ندی نالے سوکھے ہیں
کیسی وحشت ہے
یہاں بچے بھوکے ہیں

میری چنری میں فیتے ہیں
پانی نہیں ملتا
اب آنسو پیتے ہیں

دانتوں کا منجن ہے
ایسے دھواں چھوڑے
یہ بس ہے کہ انجن ہے

چنگیز ہلاکو ہے
مجھ کو ڈر لاگے
ڈاکٹر ہے کہ ڈاکو ہے

ہم لکشمی جائیں گے
ہائی کولیسٹرول ہے
اور ٹکاٹک کھائیں گے

کتنا من موجی ہے
اس کو سیلوٹ کروں
میرا ماہیا فوجی ہے

کیمپس کی بہاریں ہیں
نہر کنارہ ہے
جوڑوں کی قطاریں ہیں

مہندی کی رات آئی
فلم کا منظر ہے
بالی وُڈ سے برات آئی

ہائے وے تو پیارا ہے
کوچیں ڈائیو کی
غیروں کا سہارا ہے

ذرا کھل کر ہنس ماہیا
ایئر کنڈیشنڈ ہے
ڈائیو کی بس ماہیا

ہائی وے کا زمانہ ہے
مہنگی فلائٹ ہے
بائی روڈ ہی جانا ہے

نوشہرہ ہے، بکھر ہے
جاتے ہیں امریکا
سب ایڈ کا چکر ہے

ہائی وے تو بہانہ تھا
کرنی کرپشن تھی
اور مال بنانا تھا

شادی ہے امیروں کی
پیچھے پڑ گئی ہے
اک فوج فقیروں کی

اک خواب سہانا ہے
لُوٹیں گے جی بھر کے
سرے محل بنانا ہے

پھولے نہ سماتے ہو
اُردو میں انگلش کے
پیوند لگاتے ہو

راوی کا کنارہ ہے
شاپنگ فوٹریس میں
پیسوں کا سہارا ہے

ہم انگلش پڑھتے ہیں
رہ کر مشرق میں
مغرب پر مرتے ہیں

میکڈونلڈ جاتے ہیں
روٹی نہیں ملتی
ہم برگر کھاتے ہیں

بیوٹی پارلر جاتے ہیں
خود کو نہ جانے کیوں
ہم فول بناتے ہیں

یہ کیسی شادی ہے
خالی بوتل تو
خانہ بربادی ہے

ولایتی ماہیے

یوکے میں بستے ہیں
کیسا مقدر ہے
روتے ہیں، نہ ہنستے ہیں

یہ کیسی ولایت ہے
کالوں کو جب دیکھو
گوروں سے شکایت ہے

یہ ایسی ولایت ہے
جس میں گوروں کو
کالوں سے شکایت ہے

انگلینڈ کے کیا کہنے
میموں نے گرمی میں
کپڑے ہی نہیں پہنے

ریشم کی ڈوری ہے
بچ کے ذرا چلنا
انگلینڈ کی گوری ہے

بڑے سندر سپنے ہیں
اپنے دُور ہوئے
اب گورے ہی اپنے ہیں

سڑکوں پر کاریں ہیں
دیسی میموں کی
ہر طرف بہاریں ہیں

یہ کیسی دھرتی ہے
گوری تو گوری ہے
کالی گٹ مٹ کرتی ہے

ہم کیسے سوالی ہیں
پہنچ گئے یورپ
اور جھولیاں خالی ہیں

پردیس میں آ بیٹھے
چھوڑ کے گھر اپنا
گھر اور بسا بیٹھے

باغوں میں جھولے ہیں
گرمی پونڈوں کی
اوقات ہی بھولے ہیں

کلچر کا رونا ہے
آ کے ولایت میں
اب کچھ تو کھونا ہے

کیسے فریادی ہیں
شکوہ کریں کس سے
ہم اپنے ہی قیدی ہیں

کس دیس میں رہتے ہیں
بچے پیرنٹس کو
یہاں شَٹ اَپ کہتے ہیں

افیوں ہے، گانجا ہے
بگڑ گئے بچے
یہ درد تو سانجھا ہے

انگلینڈ میں سردی ہے
نشے نے جوانوں کی
کیا حالت کر دی ہے

کیا اس پر بیتی ہے
ناری ولایت کی
اب وہسکی پیتی ہے

یہ دیسی گوری ہے
کھاتی ہے چکن تِکا
اور کہتی سوری ہے

چنری میں تارے ہیں
لاٹری نکل آئی
اب وارے نیارے ہیں

پکے ہیں، نہ کچے ہیں
کہتے ہیں آئی لو یو
انگلینڈ کے بچے ہیں

ماتھے پہ پسینا ہے
بچوں سے تنگ آئی
چھٹیوں کا مہینا ہے

میں آہیں بھرتی ہوں
دیکھ منگیتر کو
جیتی ہوں نہ مرتی ہوں

کشمیر کی وادی ہے
جائے کوئی روکے
یہ جبری شادی ہے

دادا ہے، نہ دادی ہے
پکڑ کے ڈیڈی نے
شادی کروا دی ہے

سب زخم چھپاتے ہیں
رہنے کا یورپ میں
ہم قرض چکاتے ہیں

گو جان سے جائیں گے
چھپ کر لاری میں
ہم یورپ آئیں گے

افطاری کھائیں گے
روزہ نہیں رکھتے
اور عید منائیں گے

ملکہ کا زمانہ ہے
دل کی ملکہ تو
شہزادی ڈیانا ہے

انگلینڈ کے میلے ہیں
جھرمٹ لوگوں کے
ہم پھر بھی اکیلے ہیں

ہیما ہے کبھی ریکھا
رہتے ہیں یو کے میں
لندن ہی نہیں دیکھا

میرے ہاتھ میں چابی ہے
روز جھگڑتا ہے
گھر والا شرابی ہے

گوری ہے، نہ کالی ہے
سانولی بیوی میری
بڑی کرماں والی ہے

ہم دن کو سوتے ہیں
جاب کرے بیوی
بچے جان کو روتے ہیں

ہاتھوں میں لکیریں ہیں
پاؤں میں شوگر کی
میٹھی زنجیریں ہیں

یہاں کون ہمارا ہے
سردی دشمن ہے
ہیٹر کا سہارا ہے

گھوڑوں پہ شکاری ہیں
اور کہاں جائیں
ملکہ کے پجاری ہیں

سر درد پرانا ہے
پیر کوئی ڈھونڈو
تعویذ منگانا ہے

چھٹی کا دن ماہیا
کیسے گزرے گا
یہ فلم کے بِن ماہیا

یہ اچھا بہانہ ہے
خط اب کون لکھے
آئی ٹی کا زمانہ ہے

بنگلہ ہے، نہ گاڑی ہے
یوکے سیاست تو
بس مفت کی خواری ہے

کوچیں کروائیں گے
لیڈر آئے ہیں
فوٹو بنوائیں گے

آدھی ہے، نہ ساری ہے
دیسی سیاست نے
ایسے مت ماری ہے

ہمیں ڈسکو جانا ہے
برگر لے آؤ
کیا کھانا پکانا ہے

میرج بھی مصیبت ہے
بیڑیاں پاؤں میں
کیا پیار کی قسمت ہے

کیوں دیکھتے ہو ایسے
مائیکرو ویو نہیں
کھانا گرم کروں کیسے

اوقات دکھا دوں گا
ویزا ملے پکا
تیرے ہوش اُڑا دوں گا

ہیریں ہیں، نہ رانجھے ہیں
ہم نے ہوٹل میں
برتن بھی مانجھے ہیں

ہم کتنے سوہنے ہیں
جاب نہیں ملتی
ملکہ کے پروہنے ہیں

مجھے ڈائیٹنگ کرنی ہے
وِیک ہے وِل پاور
بڑی فائیٹنگ کرنی ہے

شادی میں جانا ہے
بینیفِٹ ٹک دے دو
نیا جوڑا سلانا ہے

کیوں بک بک کرتی ہو
جوتا ولایتی میرا
تم سہہ نہیں سکتی ہو

کونجوں کی ڈاریں ہیں
بینیفِٹ آفس میں
بڑی لمبی قطاریں ہیں

باغوں میں جھولے ہیں
دیس کی یادیں تو
صحرا میں بگولے ہیں

ہم چھٹیاں مناتے ہیں
گھر ہے بھائی کا
سر بھابی کا کھاتے ہیں

غالبؔ ہے کہ جالبؔ ہے[1]
اُردو ہی لکھتا ہے
شہرت کا طالب ہے

۱۔ برطانیہ میں کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ لوگ شہرت کے لئے اُردو میں لکھتے ہیں۔

کیوں جی کو جلاتے ہو
اُردو کو ہندی کا
تڑکا کیوں لگاتے ہو

یوں مارتے باؤنسر ہیں
گُھر کو گھر کہیں
بی بی سی کے اناؤنسر ہیں

بس آتی ہے، جاتی ہے
یو گو، می گو ہے
انگلش نہیں آتی ہے

اک روڈ میں رہتے ہیں
لانگ ٹائم اور نو سی[1]
جب ملتے ہیں کہتے ہیں

۱۔ Long time , no see

انگور کی بیلیں ہیں
بن گئے ڈِس ایبل
اب ریلیں پیلیں ہیں

میری گاڑی ٹوٹ گئی
بس پر جانے کی
اب عادت چھوٹ گئی

ٹوری ہے کہ لیبر ہے
پاکی کہتا ہے
میرا گورا نیبر ہے

گاڑی کا سٹیئرنگ ہے
محکمہ ویلفیئر کا
یہاں کتنا کیئرنگ ہے

بڑا مہنگا لیدر ہے
دل میرا گھبرائے
یہ کیسا ویدر ہے

اب لگ گئی پنشن ہے
دُکھتا ہے سر میرا
مجھے ہائپر ٹینشن ہے

ذرا بتی جلا دینا
دل گھبراتا ہے
زی ٹی وی لگا دینا

برسات کا موسم ہے
ویزا نہیں لگتا
ملاقات کا موسم ہے

یہ کیسی الجھن ہے
سوشل ورکر تو
میری جان کی دشمن ہے

جی پی سے یارانہ ہے
نوکری کون کرے
سِک نوٹ بنانا ہے

ایسے نہ ہِل ماہیا
آنے والا ہے
اب فون کا بِل ماہیا

سردی ہے کڑاکے کی
منہ میں دانت نہیں
ہو خیر بڑھاپے کی

اب تن میں جان نہیں
ہوم میں آ بیٹھے
اولاد کا مان نہیں

بڑے اچھے فائٹر ہیں
اک دن مانو گے
یوکے کے رائٹر ہیں

بیڈ روم میں جاتے ہیں
نیند نہیں آتی
اب گولیاں کھاتے ہیں

کڑوے ہیں سُکھ ماہیا
کس کو سنائیں اب
انگلینڈ کے دُکھ ماہیا

دوہے

اونچی تیری شان ہے مولا، اونچا راج سنگھاسن
عیب نہیں کوئی تجھ میں مولا، کیوں کر گنوں محاسن

سارے جگ کا رکھوالا تو، ہم تیرے محتاج
حکم عدولی کرتے ہوئے کیوں آئے نہ ہم کو لاج

جس کے عشق میں ڈوب کے تم نے کہہ دیا کُن فیکون
اسی دوارے جا کر پائیں ہم بھی انت سکون

آدم کو جنت سے نکالا، کیسا تھا یہ ناٹک
حشر تلک اب اس جنت کا بند رہے گا پھاٹک

جنت میں جانے کی ہائے کیا کیا شرطیں رکھ دیں
اوپر سے ابلیس کی باگیں کتنی ڈھیلی کر دیں

پیدا کیا انسانوں کو فی احسن تقویم
تاجِ نیابت سر پر رکھ کر ہم کو دی تکریم

ڈالی ڈالی اُڑیں پکھیرو ، تیرے ہی گُن گائیں
تیرا نام ہی وِردِ زباں ہے، کیسے تجھے بتائیں

تیری عبادت کریں فرشتے، اور انھیں کیا کام
سارے کام تو ہم کو سونپے، پھر بھی ہم بدنام

آتما تن کا ایسا ناتا، بھید نہ کوئی پائے
جب تو چاہے تیرا فرشتہ آ کر روح لے جائے

قبر اندھیری، ماٹی ماری، مجھ کو ہے ڈر لاگے
اس کے شکنجے میں جو آئے پھر وہ کیسے بھاگے

جنت اور جہنم کی چنتا ہے مجھ کو گھیرے
بند کرو یہ ناٹک سائیں، ہم بندے ہیں تیرے

ہم کو بلاؤ کعبے میں اور بھید نہ کوئی کھولو
موسیٰ جب بھی طور پہ آئے، بڑے رسان سے بولو

عشق کا کومل بوٹا جس نے خونِ جگر سے سینچا
اک نعرہ مستانہ لگا تو دار پہ اس کو کھینچا

تین سو تیرہ تیرے مجاہد، کھڑی کفار کی فوج
ہار کہاں سکتے ہیں ربا، کریں جو حق کی کھوج

حق کی راہ میں مرنے والے جنت کے حق دار
حوریں ان کی جیون ساتھی بنیں ہزاروں بار

ابراہیم کی آنکھ کا تارا، ماں کا راج دُلارا
اک بچے کی قربانی نے سب کا بخت سنوارا

صفا سے لے کر مردہ تلک پھرتی تھی ماری ماری
چاروں اور وہ کھوجے جَل کو، سمے بڑا تھا بھاری

کومل کومل ایڑیوں سے پھر پھوٹا ایسا چشمہ
چشمہ زم زم کا تھا گویا ربّ کا ایک کرشمہ

حکم ہوا ساری امت کو، اس سے پیاس بجھاؤ
کرو طوافِ کعبہ من سے، ربّ کے درشن پاؤ

تیرے دوارے آنے والے خوش قسمت کہلائیں
گاتے ہوئے لبیک ترانہ ہم بھی مکے جائیں

عرفہ کا دن ہم کو ملا اور ہو گیا جنم دوبارہ
رشک سے ہم کو دیکھیں فرشتے، خوش ہے رب پیارا

مندر جاؤ ، مسجد جاؤ، ربّ تو ایک ہے بھائی
وہ ہی احد ، وہ ہی واحد، دوئی کا ہے بنائی

نرک سورگ کا چکر کیا ہے، ہم کچھ ناہیں جانیں
ماں سے بڑھ کر تیری محبت، ہم بس یہ ہی مانیں

کالی کملی کاندھے پر تھی، آنکھ بڑی متوالی
ڈوب رہی بحرِ عصیاں میں دنیا اس نے بچا لی

گمراہی کا ایک سمندر، جس کے کنارے ناگ
زہر بھری پچکاری ماریں، منہ سے اُگلیں آگ

غم نے اس کے من کے اندر ایسی مچائی ہلچل
امت ہی کے دھیان میں گزرا جیون کا ہر اک پل

کفر و شرک کی کالی آندھی سنے نہ کوئی بات
ٹھان لی جی میں لیکن اس نے، دے کے رہیں گے مات

دُرِّ یتیم بنایا اس کو، بھید بڑا تھا گہرا
دُکھ اس کی جاگیر بنائے، اس پر غم کا پہرا

گونج اٹھی مکے کی وادی، ایسا دیا پیغام
سن کے جنھوں نے بات نہ مانی، برا ہوا انجام

کتنا سوہنا ، کتنا سُندر، اپنا نبیؐ پیارا
گوپیاں بھول کے کِشن کنہیا، ڈھونڈیں ترا سہارا

عشق کی مے ہم پی بیٹھے ہیں، یار نظر نہ آئے
مرتے دم تک اس کو کھوجیں، چاہے جہاں چھپ جائے

عشق ترے نے من کے اندر ایسی جوت جگائی
تیرے بنا کچھ نظر نہ آئے، حاضر کُل خدائی

رات معراج کی یار پیارا آیا تیرے پاس
دید کی پیاسی اکھیاں دیکھیں، بجھے نہ من کی پیاس

جیم جدائی کی گھڑیاں اب بیتیں نہیں اکیلے
آن ملو اب ساجن تم بھی کس کارن کے میلے

دُور نظر سے ہو جاؤ پر دل سے دُور نہ ہونا
لاکھ جتن سے پیار خزانہ پایا، اب نہ کھونا

رات مرادوں والی آئی، گجرا ہر سو مہکے
خوشبو اُڑتی پھرے سانوریا، من کا پنچھی چہکے

دھیمی دھیمی پریم کی اگنی کیسے من کو جلائے
دل کی پیتم اپنی بھاشا کوئی سمجھ نہ پائے

برکھا اور بادل کو دیکھو، کھیلیں آنکھ مچولی
من سے میرے ہُوک سی اٹھے کہاں مِرا ہمجولی

چُن چُن سپنے آشاؤں کے ہار پروتی جاؤں
جب بھی پیتم آئے دوارے، اس کو ہی پہناؤں

پہن لیا ہے پریتم کا چولا، اب غم ناہیں کوئی
دُور ہے مجھ سے پیتم میرا، پھر بھی میں نہ روئی

رونا دھونا چھوڑ ری گوری، جیون ہے انمول
پردیسی پیتم کی خاطر جیون دان نہ رول

لوک لاج کو تج کے میں تو چلی پیا کے ساتھ
روک سکو تو روک لو مجھ کو، پکڑا پی کا ہاتھ

پکڑ کے پی کا ہاتھ چلی ہو، اتنا رہے گمان
نظر نہ لاگے پیار کو تیرے، بیری کُل جہان

چھاجوں پانی برس رہا ہے، پیار کا چھاتا لاؤ
بھیگ چلی رے میں تو دیّا آ کے مجھے بچاؤ

تو پنجاب کا گھبرو ہے تو میں بھی روپ کٹاری
دیکھے مجھ کو جو بھی تاکے اور نہ کوئی ناری

میں سلفے کی لاٹ ہوں سجناں، تو گھبرو پنجابی
سیدھے راہ پہ آ جا ورنہ ہو گی بڑی خرابی

کِھلے شگوفے پیڑوں پر، رُت پیا مِلن کی آئی
من ہی من میں دیکھ کے اس کو گوری ہے شرمائی

روٹھ گئی نینوں سے نِندیا، رینا بیتی جائے
جس رینا میں آئے پیتم، وہ رینا نہ آئے

کاجل، ٹیکا، مہندی، پائل سب ہی شور مچائیں
یاد کریں بچھڑے پیتم کو، ہر دم اُسے بلائیں

سو گئے تارے، نیند کے مارے اور جاگے اِک برِہن
لوٹ کے جانے کب آؤ گے، چوکھٹ پر ہیں نینن

کانٹے تیری راہ کے گوری پلکوں سے میں چُن لوں
نکل سکے نہ جیون بھر تُو، جال میں ایسا بُن دوں

نیناں بھرسیں ساون بھادوں، کجلا بکھرا جائے
راہ تکوں بیٹھی ساجن کی، کب ساجن گھر آئے

کاجل، مسّی، بِندیا، پائل پیار کے سب پہناوے
آ جائے گا ساجن تیرا، کیوں کجلا بکھراوے

کتنے ساون بیتے مجھ کو، پیتم نظر نہ آئے
کومل ڈوری پریم کی سجناں، ٹوٹ کہیں نہ جائے

پریم کی ڈوری کچی ناہیں، پل بھر میں جو ٹوٹے
جنم جنم کا ناتا ہے یہ، ساتھ کہاں یہ چھوٹے

ہمرے من کی چاہ کرے وہ ، مفت نہیں دل دینا
سچا سودا پریم کا سجنا، دل دینا اور لینا

جھوٹ موٹ کا پیار جتائے ، میں طوطا تو مینا
ایسی بانوری نہیں میں جاؤ ، کھوؤں جو دل کا چینا

پریم کا سندر گہنا پہنا، چلی پیا کے گاؤں
بیتے گا اب جیون سُکھ سے ، اپنے پریم کی چھاؤں

پریت کے نام لگا بیٹھی ہوں جیون ، جاگ ، سویرا
پیار میں ایسی سُدھ بُدھ کھوئی، کیا تیرا کیا میرا

پریم کی ڈوری بیری سجناں، راہ میں کاہے توڑی
پریم سندیسہ لے کے آ جا، راہ تکے ہے گوری

چھوڑ گیا جو راہ میں پگلی، اس سے کیسی آشا
شام ہوئی گھر لوٹ کے آ جا، کاہے بنی تماشا

بیر بہوٹی بن کر بیٹھی، کب ساجن گھر آئے
پاگل منوا پہلو میں رہ رہ کر شور مچائے

پاگل منوا گوری تیرا، کاہے شور مچائے
آتا ہو گا پیتم تیرا، کر نہ ہائے ہائے

رُت ساون کی بیتی جائے، پیا نظر نہ آئے
تھال سجا کر بیٹھی ہوں، وہ آئے، گلگلے کھائے

گلگلے تیرے دیسی گھی کے، نظر نہ ان کو لاگے
کھائے تیرے گلگلے جو بھی، پیار میں سرپٹ بھاگے

بستی تیری دُور ہے ساجن، پاؤں پڑے ہیں چھالے
بیری کانٹے چبھ چبھ جاویں، ان کو کون نکالے

کاجل کا ہے کام بکھرنا، کیوں ری تُو گھبرائے
دید کا کاجل آنکھ میں بھر لے، کبھی نہ جو بہہ پائے

ساجن تیرا روٹھ گیا ری، اس کو کون منائے
جگ میں ایسا کوئی نہیں جو سوئے بھاگ جگائے

راہ تکوں ساجن کی بیٹھی، کب ساجن گھر آئے
سونی راہ کو دیکھ کے دل کی پیڑ سہی نہ جائے

آجائے گا ساجن تیرا، کاہے کی ہے جلدی
پی کے درشن کیسے بِنا اب اور کہاں تُو چل دی

پھوڑ دی گاگر بیچ بجریا، لاج اسے نہ آئے
گھاگرا چولی بھیگا، گوری لاج سے مرتی جائے

گوری بن میں جھولا جھولے، گیت مِلن کے گائے
آئے ساجن چپکے سے اور من کے پھول کھلائے

ہرجائی بھنورا ہے دیکھو، کلی کلی منڈلائے
جس کلیا کے پاس سے گزرے، اس کا من گھبرائے

چندرما آکاش پہ چمکے، کہاں ہے پیتم میرا
آنکھ مچولی کھیلیں تارے، من میں بڑھے اندھیرا

پریم کے پنچھی اُڑتے جائیں، گیت انوکھے گائیں
پریم سے خالی من کی سمجھ میں گیت نہ ان کے آئیں

ہجر کی سوئیاں سر میں اٹکیں، آؤ پیا نکالو
دم اکھین میں اٹکا، اب تو آ کے مجھے بچا لو

پھاگن بیتا ، چیت بھی بیتا، ختم ہوئی نہ جدائی
کہاں گیا ری ساجن تیرا، پوچھے کُل خدائی

پریم کا روگ لگا بیٹھی ہوں، آئے کوئی یوگی
ڈھونڈ کے میرا پیتم لائے ، میں ہوں دل کی روگی

پریم میں تیرے جوگن بن گئی ، دنیا راس نہ آئی
سچا ہے بس پیتم میرا، جھوٹی کُل خدائی

جگ کی رِیت نرالی بابا، ہم کو سمجھ نہ آئے
جو دُکھیوں کی کرے ہے چِنتا ، وہ روگی کہلائے

پی کے خون غریبوں کا اب لوگ بنیں دھن وان
حال غریب کا کوئی نہ پوچھے، کہاں ہے تُو بھگوان

عقل کے اندھو ! کیوں کہتے ہو، یہ تیرا یہ میرا
کون سدا جگ میں رہنے کا، چڑیاں رین بسیرا

جوگی والا پھیرا سب کا، جگ تیرا نہ میرا
من میں پیار کی جوت جگا لو، جس میں گھور اندھیرا

اہلِ نظر
کے
تاثرات



حسنِ ترتیب

انتسابات

گلابوں کو تم اپنے پاس رکھو......(غزلیں، نظمیں)

انتساب ماں کے نام

اپنی بیٹیوں ثنا اور وَردہ کے نام

سب آنکھیں میری آنکھیں ہیں......(نظمیں)

انتساب ان آنکھوں کے نام جو بصارت کے

ساتھ ساتھ بصیرت بھی رکھتی ہیں

میں عورت ہوں......(نثری نظمیں مع انگریزی ترجمہ)

انتساب دوستوں جیسی بہنوں اسماء اور عابدہ

کے نام

پیپل کی چھاؤں میں......(ماہیے)

انتساب میرے گاؤں کے نام

ہوا کے سنگ سنگ......(غزلیں، نظمیں، دوہے)

انتساب تمام قلم کار خواتین کے نام

تعارفی تقریبات

۱۔ ''گلابوں کو تم اپنے پاس رکھو''......اسلام آباد......(۲۰۰۰ء)

صدارت: افتخار عارف

۲۔ ''سب آنکھیں میری آنکھیں ہیں''......لاہور......(۲۰۰۰ء)

''میں عورت ہوں''

''گلابوں کو تم اپنے پاس رکھو''

صدارت: فرحت عبّاس شاہ

۳-''گلابوں کو تم اپنے پاس رکھو''......لاہور......(۲۰۰۱ء)

''میں عورت ہوں''

''سب آنکھیں میری آنکھیں ہیں''

''پیپل کی چھاؤں میں''

''چاند میں چڑیلیں''......(نثر......طنز و مزاح)

صدارت: بشریٰ رحمٰن

۴-''گلابوں کو تم اپنے پاس رکھو''......لندن......(۲۰۰۲ء)

''میں عورت ہوں''

''سب آنکھیں میری آنکھیں ہیں''

''پیپل کی چھاؤں میں''

''چاند میں چڑیلیں''......(نثر......طنز و مزاح)

صدارت: رضا علی عابدی

۵-''گلابوں کو تم اپنے پاس رکھو''......برمنگھم......(۲۰۰۲ء)

''میں عورت ہوں''

''سب آنکھیں میری آنکھیں ہیں''

''پیپل کی چھاؤں میں''

''چاند میں چڑیلیں''......(نثر......طنز و مزاح)

صدارت: ڈاکٹر شہناز مزمل

مجھے کانٹوں پہ چلنا آ گیا ہے

ایک زمانہ تھا، ادبی رسالے لکھنے والوں کی ضرورت تھے اور لکھنے والے ادبی رسالوں کی ضرورت۔ لیکن ادبی رسالوں کی گروہ بندیوں، داغ دار کردار اور گھٹیا ادب کی وجہ سے اب ادبی رسالے لکھنے والوں کی ضرورت نہیں رہے۔ اگرچہ لکھنے والے آج بھی ادبی رسالوں کی ضرورت ہیں۔ اس لئے لکھنے والوں کے بغیر تو کوئی رسالہ بھی شائع نہیں ہو سکتا۔ جب کہ اچھا شاعر اور اچھا شعر کسی رسالے یا جریدے کا محتاج نہیں ہوتا۔ رسالوں کے اس گھٹیا ادب اور ادبی رسالوں کے داغ دار کردار اور گروہ بندیوں کی بدولت اب شاعر اور شاعرات یہ بہتر سمجھتے ہیں کہ رسالے میں چھپنے کا تکلف کرنے کی بجائے سیدھی سیدھی اپنی کتاب ہی شائع کرا دی جائے۔ ویسے بھی ادبی رسالوں کی نسبت ہمارے یہاں ادبی کتاب زیادہ پڑھی جاتی ہے اور رسالوں کی نسبت بکتی بھی اور چھپتی بھی زیادہ ہے۔ اس میں مسئلہ صرف یہ پیدا ہو جاتا ہے کہ رسالے میں چھپنے سے شاعر یا شاعرہ کا ادبی حلقوں میں جو تعارف ہو جاتا تھا وہ اب نہیں ہوتا۔ اس لئے یہ فیصلہ کرنا کہ شاعری کی کون سی کتاب پڑھی جائے اور کون سی کتاب نہ پڑھی جائے جائے، خاصا مشکل ہو جاتا ہے۔ کیا خبر کس کتاب کی پٹاری میں سے کیا نکل آئے۔

ویسے بھی ادب کے پھیلاؤ سے ملک اور بیرون ملک تخلیق ہونے والے ادب نے یہ مسئلہ اور بھی گنجلک کر دیا ہے۔ اندرون ملک لکھنے والے شاعر اور شاعرات کو تو صرف دو طرح

کے تناظر میں دیکھا جاتا ہے۔ ایک شاعر کی حیثیت سے اور دوسرے شاعرہ کی حیثیت سے۔شاعر تو شاعر ہے لیکن خواتین کے معاملے میں اور بھی کئی مسائل سامنے آجاتے ہیں، جو سب لوگوں کو معلوم ہیں۔ بیرونِ ملک لکھنے والے شاعر اور شاعرات کو البتہ کئی دوسرے پہلوؤں سے بھی پرکھا جاتا ہے۔ایک تو یہ کہ انھیں صرف ان کے غیر ملکی تناظر میں دیکھا جائے۔جن میں اکثر شاعر اور شاعرات صرف اسی لئے Exist کرتے ہیں کہ وہ انگلستان یا امریکہ میں شاعری کر رہے ہیں۔ پاکستان میں ہوتے تو شاید صرف کسی کریانے کی دکان پر نوکری کر رہے ہوتے۔لیکن کچھ لوگ یقیناً ایسے بھی ہیں جنھیں ان کے گردونواح میں محدود کر کے دیکھنا ان کی شاعری کے ساتھ یقیناً ناانصافی ہے۔ان میں انگلستان کے لوگوں میں ارشد لطیف، یاسمین حبیب، یشب تمنا، فیضان عارف اور باصر کاظمی کے نام یقینی طور پر لیے جا سکتے ہیں۔اسی طرح رضیہ اسماعیل بھی یقیناً ایک ایسا ہی ادبی حوالہ ہے جسے غیر ملکی تناظر سے نکال کر باقاعدہ طور پر اُردو ادب کے تناظر میں دیکھا جا سکتا ہے۔رضیہ اسماعیل ادبی افق پر ابھرنے والی ایک نئی شاعرہ ضرور ہے لیکن اس کی غزل اور بالخصوص نثر نظم کسی بھی پختہ ادب کے تناظر میں دیکھی جا سکتی ہے۔ رضیہ اسماعیل کی غزل اور نثری نظم کا معیار اُردو ادب کے معیار پر ہر اعتبار سے پورا اترتا ہے۔ رضیہ نے غزل اور نظم ایک جیسی توانائی اور ایک جیسی تخلیقی قوت سے لکھی ہے۔غزل رومانی لہجے میں زندگی کے دکھ درد اور ہجر و وصال کے تمام مدارج سے گزر کر اور اِن دکھوں اور راحتوں کو انتہائی شدت سے محسوس کر کے لکھی گئی ہے۔غزل کی زبان کی سلاست اور روانی کے ساتھ جو تخلیقی بہاؤ ہے وہ یقیناً کسی بھی لکھنے والے کے لئے قابلِ رشک حیثیت رکھتا ہے۔البتہ آزاد نظم سے احساس ہوتا ہے کہ اس نے شاعری کی ابتدا اسی صنفِ سخن سے اور اس وقت کی جب اس کی تخلیقی قوت صرف ایک طوفان کی حیثیت رکھتی تھی۔اس کی کوئی تنظیمی صورت نہیں تھی۔رضیہ نے غالباً اس وقت اپنی تحریری راہیں متعین نہیں کی تھیں اور ہر لکھنے والے کی طرح ابتدا میں صرف لکھا اور لکھا۔تخلیقی

بادل آتے رہے، چھاتے رہے اور برستے رہے۔ یہ نہیں دیکھا کہ انھیں کن زمینوں پر برسنا ہے اور کتنا برسنا ہے۔ اس کے باوجود نظمیں معیار اور فن کی سطح پر آج کی لکھی جانے والی نظموں کی سطح پر ہی لکھی گئی ہیں۔

حیرت کی بات صرف یہ ہے کہ رضیہ نے جو تین اصنافِ سخن اپنے اظہار کا ذریعہ بنائی ہیں، اپنے موضوعات کے اعتبار سے وہ تینوں اصناف قطعی طور پر ایک دوسرے سے مختلف ہیں۔ جیسا کہ میں پہلے عرض کر چکا ہوں کہ غزل انتہائی رومانی لہجے میں کہی گئی ہے اور اس کے موضوعات بھی زیادہ تر ہجر و وصال کی مختلف کیفیات کے مظہر ہیں۔ جب کہ نثری نظم میں رضیہ اسماعیل نے خاص طور پر عورت کے عورت ہونے پر بہت سی نظمیں لکھی ہیں ۔عورت کے مختلف پہلوؤں کو انتہائی شدت سے محسوس کیا ہے۔عورت کا ماں کا مقام اور اس پر احساسِ تفاخر، عورت کی جسمانی طور پر تخلیقی ہونے کے پہلو پر فخر کا احساس، اس کے مظلوم ہونے کا کرب، بیٹی اور بہن ہونے کا ادراک، عورت کی حیثیت سے Exploitation اور عورت کے اپنے مختلف کردار اور اس کے ساتھ معاشرے کے برتاؤ کے بہت سے پہلوؤں پر بڑی قوت سے سخن وری کی ہے۔عورت ہونے کی بدولت عورت کی بقا کے علاوہ عورت کے بانجھ ہونے سے لے کر تصویرِ کائنات میں رنگ ہونے تک کے بہت سے پیکروں کو ان گنت زاویوں سے دیکھا ہے۔ جب کہ نظمِ آزاد میں رومانی موضوعات اور عورت کے عورت ہونے کے مضامین کا امتزاج ملتا ہے۔

غزل اور نظم دونوں اپنی کرافٹ اور موضوعات کی طرف شاعرہ کی اپروچ کے اعتبار سے بہت کامیاب تخلیقات ہیں۔

رضیہ اسماعیل صرف اس لئے شاعرہ نہیں ہے کہ وہ پاؤنڈز اور ڈالرز خرچ کر کے شاعری خرید سکتی ہے۔ نہ صرف وہ اس لئے شاعرہ ہے کہ وہ ان خواتین میں سے ہے جو جب چاہیں، جس شاعر سے چاہیں، اس کی شاعری اپنے نسوانی ہتھکنڈوں سے ہتھیا کر اپنے

نام لگالیں۔ نہ ان خواتین میں سے ہے جو کسی بڑے شاعر کی منہ بولی رشتہ دار بن کر شاعری میں کوئی وزن پیدا کرسکتی ہے بلکہ رضیہ اسماعیل اس لئے شاعرہ ہے کہ وہ ایک اوریجنل (Original) اور جینوئن (Genuine شاعرہ ہے۔ اور وہ یقینی طور پر غیر ملکی حیثیت اور خاتون شاعرہ ہونے کے Barriers اگر کراس نہیں کر چکی تو انھیں کراس کرنے کی مکمل صلاحیت ضرور رکھتی ہے۔ بلکہ اس سلسلے میں بیرونِ ملک بسنے والی تمام خواتین کو (سوائے افتخار نسیم کے) رضیہ اسماعیل سے باقاعدہ خائف رہنا چاہیے کہ وہ کسی وقت بھی سب کو پیچھے چھوڑ چھاڑ کے ادب کے کسی بھی قابلِ رشک مقام و مرتبہ پر فائز ہو سکتی ہے۔ میں رضیہ اسماعیل کو برمنگھم کے لکھنے والوں سے اس لئے بھی Compare نہیں کروں گا کہ اس میں بہت سے لکھنے والوں کے ادبی تختے الٹ جانے کا اندیشہ ہے۔ جن میں صرف پردہ نشینوں کے نام ہی نہیں آتے، کئی بے پردہ نشینوں کے نام بھی آتے ہیں۔ جس طرح میں پاکستان میں شاعری کے حوالے سے آج کل فاخرہ بتول کے ساتھ کسی خاتون کا نام نہیں لے سکتا اسی طرح مجھے انگلستان میں بھی رضیہ اسماعیل اور یاسمین حبیب کے ساتھ کسی اور کا نام لینا اچھا نہیں لگتا۔

عین ممکن ہے انگلستان میں رہنے والے رضیہ اسماعیل کے بارے میں میری اس رائے پر حیرت کا اظہار کریں۔ میں ان کی خدمت میں یہ عرض کروں کہ جس سرعت کے ساتھ رضیہ اسماعیل نے اپنا تخلیقی سفر طے کیا ہے مجھے بذاتِ خود وہاں کے احباب سے زیادہ حیرت ہے۔ رضیہ اسماعیل کے یہ Literary leaps and bounces حقیقی طور پر اتنے حیران کن ہیں کہ میں اپنے اس Unique تجربے کو لفظوں میں بیان ہی نہیں کرسکتا۔ پس یوں لگا کہ سوئچ آن کر دیا اور ایک سیکنڈ میں روشنی ہوگئی۔ اگر رضیہ اسماعیل کا یہ تخلیقی سفر میری وہاں موجودگی ہی میں طے نہ ہو پاتا تو میں کسی بھی شاعر یا شاعرہ کی اتنے حیرت ناک Fast progress پر کبھی یقین نہ کرتا۔ اور مجھے اس پر اس بنا پر بھی یقین کرنا پڑا کہ میں نے

ایسا ہی ایک کرشمہ فاخرہ بتول کے روپ میں بھی دیکھا ہے۔اور یاسمین حبیب کو بھی آدھے پونے گھنٹے میں ایک بے پناہ قسم کی غزل کہتے ہوئے دیکھنے کی قسمیہ گواہی دے سکتا ہوں۔ بلکہ رضیہ اسماعیل نے جو مکالماتی غزلیں کہی ہیں وہ میری اور فاخرہ بتول کی مکالماتی غزلوں کے بہت قریب دکھائی دیتی ہیں اور میرے مصرعوں پر گرہیں لگا کر جو غزل اس نے Complete کی ہے، مجھے وہ اپنی مکالماتی غزل سے بھی بہتر محسوس ہوئی ہے۔اور اس نے بغیر کسی خوف اور کمپلیکس کے وہ مکالماتی غزلیں بھی اس کتاب میں شامل کر دی ہیں۔ حالانکہ ایسا کرنے سے اس پر بہت سے الزامات آ جانے کا اندیشہ ہی نہیں ایک خطرہ بھی ہے لیکن جینوئن لوگوں کو ایسی باتوں کی نہ کبھی پرواہوتی ہے اور نہ ہوگی۔ اسی لئے میں نے بھی اس کتاب کا دیباچہ لکھنے میں کوئی عار محسوس نہیں کی۔

میں اس کتاب کو بڑے وثوق اور اعتماد کے ساتھ، ادبی افق پر کسی غروب ہوتے ہوئے نہیں بلکہ ایک طلوع ہوتے ہوئے سورج کی حیثیت سے پیش کرنے میں خوشی محسوس کر رہا ہوں ۔ مجھے لگتا ہے کہ رضیہ اسماعیل کے ساتھ میرے جتنے بھی ادبی Sessions ہوئے ہیں، ان کے جواب میں اس نے مجھے یہ کہہ کر خاموش کر دیا ہے

گلابوں کو تم اپنے پاس رکھو
مجھے کانٹوں پہ چلنا آ گیا ہے

شعر پھولوں کی طرح ضرور ہوتے ہیں لیکن شاعری کی پیچیدگیاں کانٹوں سے کم ہرگز نہیں ہوتیں۔

اور رضیہ اسماعیل کو حقیقتاً ان کانٹوں پر چلنا آ گیا ہے۔ میں اس کتاب پر رضیہ اسماعیل کو پہلی مبارک باد پیش کرتا ہوں اور اس کے میاں اسماعیل اعظم سے جو میرا بہت پیارا دوست ہے، توقع رکھتا ہوں کہ وہ بھی اپنی تنقیدی تحریروں کو باقاعدہ طور پر کتابی صورت میں ڈھالنے کا ارادہ کر لے۔ یہ تحریریں بھی نئی تنقید میں یقینی طور پر ایک ادبی اضافہ ہوں گی۔ اس

ضمن میں وہ جتنی بار چاہے میرے ساتھ وزیر آباد کے ڈبے میں بیٹھ کر پورے اُردو تنقیدی لٹریچر کے بخیے ادھیڑ سکتا ہے۔ میں اس کے لئے وقت نکالنے کے لئے تیار ہوں اور رضیہ اسماعیل کو اجازت دے کہ وہ کچن سے نکل کر اپنی اگلی کتاب پر یکسوئی سے کام کرے۔ میں اس دیباچے کے انتہائی نجی اختتام پر قارئین کی خدمت میں اپنی معذرت پیش کرتا ہوں تا کہ وہ میری معذرت اور اس دیباچے دونوں کو قبول کر لیں۔

عدیم ہاشمی

گلابوں کو تم اپنے پاس رکھو

پوری دنیا میں عورت کی ذہنی صلاحیت کو تسلیم کرنے میں پس و پیش سے کام لیا گیا۔ کیوں کہ یہ معاشرہ مرد کا بنایا ہوا ہے۔ چناں چہ آج بھی صورت حال کچھ زیادہ مختلف نہیں ہے۔ دیکھا جائے تو خود مرد کے تشکیل کردہ فنونِ لطیفہ کے تمام شہکاروں میں عورت روح بن کر رہتی ہے لیکن عورت اپنی ذہنی صلاحیتوں کے بل پر خود کچھ تخلیق کرے، یہ عمل گویا شجرِ ممنوعہ کی حیثیت رکھتا ہے۔ سوچ عورت کے لئے ایک ایسا پھل رہی ہے کہ جسے کھا کر اسے اپنی گھریلو جنت سے باہر نکلنا پڑتا ہے۔ شاعری بھی اس سے مستثنیٰ نہیں ہے۔ شاعری میں بھی وہ موضوع تو بن سکتی ہے لیکن خود اس کا شاعری کرنا خواب و خیال میں نہیں لایا جا سکتا۔ مگر تخلیق کا شعلہ کہاں تک چھپا رہ سکتا ہے۔ بہارستان، حکیم فصیح کا وہ پہلا تذکرہ ہے جس میں ایک سو چوہتر (۱۷۴) شاعرات کا نمونہ کلام شامل ہے۔ مگر یاد رہے کہ یہ سب شاعرات مذکر کے صیغے میں بات کرتی ہیں۔ اس تمہید سے قطع نظر خوب صورت بات یہ ہے کہ پچھلی تقریباً! چار دہائیوں سے شاعرات نے اس میدان میں آ کر ایسی دھوم مچائی ہیں کہ اگلی پچھلی سب کسر نکل گئی ہے۔ گویا عورت کو زبان مل گئی ہے۔ پہلی دفعہ عورت کی شاعری میں اس کی شخصیت ایک واضح انداز میں ظاہر ہوئی۔ انتہائی ذہین اور منفرد سوچ رکھنے والی خواتین اپنی شاعری لے کر وارد ہوئیں اور اپنی ذات کے دھارے کے اندر بند نہیں رہیں بلکہ اجتماعی شعور کے حوالے سے بات کی۔ اس معاشرے کے منافقانہ رویے، دوہرے

معیار اور مجرمانہ مصلحت آمیزی پر کھل کر بات کی۔ ذاتی واردات نے عصری تقاضوں کے ساتھ مل کر ایک نیا رنگ اختیار کیا اور پھر اس پر لکھنے والی ایک عورت کو، جو کسی کے دکھ کو ایسے محسوس کرتی ہے، ایسے سمجھتی ہے کہ جیسے زمین کے اوپر بسنے والی تمام مخلوق کو جانتی ہے۔ رضیہ اسماعیل بھی اس سلسلے کی ایک کڑی ہے۔ ''گلابوں کو تم اپنے پاس رکھو'' کی شکل میں ان کے شعری مجموعے میں بھی ذاتی واردات پر اکتفا نہیں کیا گیا بلکہ مجموعی طور پر معاشرے میں پھیلی ہوئی نا آسودگی، بے انصافی، محرومی اور مظلومیت ان کی شاعری کا موضوع ہیں۔ ان کے مجموعے میں غزلیں بھی ہیں اور نظمیں بھی ہیں۔ ان کی غزلیات کا تذکرہ پہلے کرتی ہوں، وہ اس لئے کہ ان کی غزل سے بھی نظم کا تاثر ابھرتا ہے جس سے محسوس ہوتا ہے کہ ان کا اصلی میدان نظم ہے۔ جہاں تک ان کی غزل کا تعلق ہے، اس میں ایک ایسی تازگی ہے جو بہت کم نئے لوگوں کو میسر ہوتی ہے۔ ان کی غزلوں کے کچھ شعر میں آپ کی خدمت میں پیش کرتی ہوں۔

ترے جواب کے وقفے طویل کتنے ہیں
گزرتے جاتے ہیں میرے سوال کے موسم

تجھے پا کر بھی یہ دل ڈھونڈتا رہتا ہے تجھے
تو مرے پاس بھی یوں کھویا ہوا ہوتا ہے

انوکھا کام کرنا چاہتی ہوں
زمانے کو بدلنا چاہتی ہوں

اک لفظ بھی نظر نہیں آتا کتاب میں
یہ کیا لکھا ہوا ہے محبت کے باب میں

بظاہر ان اشعار کے پڑھنے کے بعد گماں گزرتا ہے کہ وہ ایک رومانی شاعرہ ہوگی۔

اس کے اشعار ایسے ہی ہوں گے کہ جس طرح جوانی میں دوسرے شاعروں کے ہوتے ہیں۔لیکن معاملہ اس کے برعکس ہے۔ بہرحال رضیہ کی غزل رومانیت سے جدیدیت کی طرف سفر کررہی ہے اور یہ ایک اچھی علامت ہے۔اس کی نظم بھی اس خوبی سے مزین ہے۔ جو چیز اس کے شعری مجموعے میں پڑھنے والے کو سب سے زیادہ متاثر کرتی ہے وہ رضیہ اسماعیل کی نظموں کے موضوعات اور اس کا ٹریٹمنٹ ہے۔عورت کا دکھ محسوس کرنا تو کوئی غیر معمولی نہیں لیکن انھیں اپنے پڑھنے والوں کے لئے ایک تیسری جہت (ڈائمینشن) کی صورت میں پیش کرنا واقعی ایک حیرت انگیز بات ہے۔اس کی نظموں کو پڑھنے کے بعد یہ احساس قاری کو پوری طرح سے اپنی گرفت میں لے لیتا ہے کہ رضیہ اسماعیل کے باطن کی عورت زندہ ہے اور کتنی زندہ ہے۔ یہ بھی احساس جاگتا ہے کہ باوجود تمام دکھوں اور محرومیوں کے، کہ جو قدرت نے اور کچھ اس معاشرے نے عورت کے لئے روا رکھے ہیں، رضیہ اسماعیل کی شاعری امید کی روشنی سے جگمگا رہی ہے۔یہ روشنی ایسی نہیں جو آنکھوں کو چکا چوند کردے، یہ تو بہت ہی دھیمی، دل کو سکون بخشنے والی اور ذہن میں نئے خواب جگانے والی روشنی ہے۔یہ اس کی نظموں میں آپ کو بین السطور نظر آتی ہے اور پڑھنے والا حیران ہوتا ہے کہ اتنا کچھ برداشت کرنے کے باوجود بھی رضیہ اسماعیل نے اپنے آپ کو Disillusioned نہیں ہونے دیا۔ورنہ ''تشنہ لب''، ''بن بیاہی''، ''پتھر کے خواب''، ''ننگے پاؤں''، ''بانجھ''، ''نئی زمین'' اور ''مجھے بولنا کیوں سکھایا'' جیسی نظموں کو لکھنے کے بعد کسی بھی حساس انسان کا Disillusioned ہو جانا کوئی تعجب کی بات نہ ہوتی۔لیکن اس میں اتنا حوصلہ ہے کہ وہ ''میں زندہ رہوں گی'' جیسی نظم کہہ سکتی ہے۔اس کی ایک نثری نظم ہے ''خوش قسمت'' ملاحظہ کیجئے۔

خوش قسمت

ہم خوش قسمت ہیں

ہمارے کتنے ہی نام ہیں

مجبور عورتیں، محصور عورتیں

لاچار عورتیں، ریاکار عورتیں

گنہگار عورتیں، کم فہم عورتیں

کم نظر عورتیں، بدگماں عورتیں

بے صبر عورتیں، بدزباں عورتیں

ہم ناشکری

ہم مسلی ہوئی

دھتکاری ہوئی

بیسوا!

بے وفا، بے نشاں

بے حیا، بے اماں عورتیں

مگر

ہمارا ایک ہی نام

کائنات کے سب ناموں پر بھاری ہے

''ماں عورتیں''......!

اسی ایک نظم سے آپ کو رضیہ کے سوچنے کے انداز اور زندگی کی طرف سے اس کا رویہ معلوم ہو جاتا ہے۔ یہ بھی پتا چل جاتا ہے کہ وہ بات کہنے کا سلیقہ بھی جانتی ہے۔

شبنم شکیل

(اسلام آباد)

عورت کی سکھی

رضیہ اسماعیل کو میں اُس وقت سے جانتا ہوں جب وہ رضیہ خالدہ تھی اور وزیر آباد کی گلی چاولیاں میں رہتی تھی۔ اس کو آس پاس کے گھروں میں ایک لائق، محنتی اور ذہین لڑکی خیال کیا جاتا تھا اور کسی کو گمان تک نہ تھا کہ میٹرک کے امتحان میں وظیفہ حاصل کرنے والی یہ ''پڑھاکو'' لڑکی ایک دن شاعری جیسی ممنوع اور معتوب حرکت کر کے اپنے شاندار تعلیمی کیریئر کو داؤ پر لگا دے گی۔ مجھے یقین ہے کہ گلی چاولیاں کی وہ بڑی بوڑھیاں جو سر پر ڈوپٹہ سرک جانے پر بچیوں کی سخت سرزنش کیا کرتی تھیں، آج رضیہ کی شاعری سنتیں تو ایک بار اس کو سخت سرزنش کر کے ضرور گلے سے لگا لیتیں۔

عورت کے ساتھ ہمارا معاشرتی رویہ ویسا ہی رہا ہے جیسا کہ کم و بیش ہماری روایتی اُردو غزل میں ملتا ہے۔ یہ ایک طویل بحث ہے جس میں پڑے بغیر صرف اتنا کہنے پر اکتفا کروں گا کہ ہمارے ہاں زندگی کا تانا بانا مکمل طور پر عورت کے گرد گھومتا ہے۔ مگر عورت کو منہا کر کے، ہم عورت کے حوالے سے ایک زبردست قسم کی منافقانہ روش کو معاشرتی قدروں کا جزو بنا چکے ہیں اور اس پر کاربند رہنے کو مذہبی فریضہ خیال کرتے ہیں۔ حالانکہ دنیا کے کسی مذہب نے بھی عورت کے اس طرح استحصال کی اجازت نہیں دی۔ مگر یہ ہمارا کمال ہے کہ ہم نے چادر اور چار دیواری کے تصور کو حقوق اور تحفظ کی بجائے غلامی، زیادتی اور محکومی سے منسوب کر دیا ہے۔ ایسے حالات میں جب عورت اپنے وجود کا یقین کرنے کی کوشش

کرتی ہے تو مرد کے لئے اپنے بنائے ہوئے معاشرے میں اتنی ہلچل ضرور پیدا ہوتی ہے جتنی ایک جوہڑ کے اندر پتھر پھینکنے پر۔ تمام جدید شعور اور انسانی حقوق کے ادراک کے باوجود عورت کو انسان تسلیم کرنے کا زمانہ ابھی بہت دُور ہے۔ رضیہ ایک ایسی عورت ہے جس نے عورت کی انسانی حیثیت کو پہچان عطا کرنے کی جدوجہد میں نہایت پُرعزم طریقے سے حصہ لینے کا اعلان کیا ہے اور اس کا ثبوت اس کی شاعری میں جا بجا ملتا ہے۔ وہ رضیہ خالدہ ہو کہ رضیہ اسماعیل، اسے اپنے ہوتے کا پتا ہے اور یہ وہ سعادت ہے جو ہمارے ہاں کی عورتوں کو شاید ہی اس زندگی میں نصیب ہوتی ہو۔ میں رضیہ کو اس نعمت کے حصول پر مبارک باد پیش کرتا ہوں اور اسماعیل کو بھی جو میرا بچپن کا دوست اور بڑھاپے کا ''متوقع لنگوٹیا'' ہے کہ اس نے رضیہ کی خودشناسی میں اس کی بھرپور معاونت کی۔ میں رضیہ اور اسماعیل ایک ہی بستی کے بچھڑے ہوئے لوگ ہیں اور اسی رشتے میں بندھے ہوئے ہیں جس کا منظرنامہ ہم ان تنگ و تاریک گلیوں میں چھوڑ آئے ہیں جہاں ہماری ادھ کھلی آنکھیں عمروں سے بڑے خواب دیکھا کرتی تھیں۔ یہی وجہ ہے کہ ہم جب بھی ملتے ہیں، لمحۂ موجود سے بالکل غافل ہو کر اسی ماضی میں کھو جاتے ہیں جو ہماری بہت سی خاموشیوں کو زبان دیتا ہے۔ ہمیں ایک دوسرے سے کچھ کہنے کے لئے تمہیدی لفظوں کی ضرورت نہیں ہوتی۔ میں رضیہ کی شاعری کا وہ قاری ہوں جسے گواہ کی حیثیت بھی حاصل ہے۔ اس لئے میں وثوق سے یہ بات کہہ سکتا ہوں کہ رضیہ نے جو کچھ بھی کہا ہے وہ سچ کہا ہے اور سچ کے علاوہ کچھ نہیں کہا۔ رضیہ کی غزلوں اور نظموں میں کیفیات کے فرق کے باوجود نمایاں بات ذات کے کرب کو اردگرد کے ساتھ ہم آہنگ کرنا ہے اور اس کا اسلوب اس صلاحیت کو بہترین طریقے سے استعمال کرنے کا وصف رکھتا ہے۔ رضیہ شعری زبان میں تفصیل کے ساتھ بات کرنے کے ہنر سے بخوبی واقف ہے۔ اس کی کتابوں کے ناموں میں وہ اعتماد ہے جو اس کی شاعری کا اصل مضمون ہے۔

یہ خوش آئند بات ہے کہ رضیہ نے اپنے تخلیقی تجربے کو نعرہ بازی اور غیر ضروری جدیدیت سے آلودہ نہیں کیا۔ اور اس کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ وہ ہمارے ہاں کی ادبی سیاست اور گروہ بازی سے دور ہی رہی۔ ورنہ یہاں تو خواتین نے اپنی ہم آواز خواتین کو چپ کا روزہ رکھنے کی تلقین کی۔ یہ اور بات ہے کہ بعد میں اسی چپ کو اپنی لیڈری چمکانے کے لئے نہایت بے رحمی سے استعمال کیا۔ میرا یقین ہے کہ شاعری کرتے ہوئے شاعر بھی ایک نوزائیدہ بچے کی طرح معصوم ہوتا ہے۔ باقی تمام معاملات فروعی اور خود ساختہ ہیں جن کا تعلق رنگ، نسل، گروہ کے علاوہ انا اور شہرت کے عوارض سے ہے۔ شاعری سے بہرحال ان کا کوئی تعلق نہیں۔

رضیہ نے اپنی شاعری میں ہجر و وصال جیسے نازک جذبوں کو بھی فطری انداز میں سمو دیا ہے۔ اس کا دُکھ اظہار کے کئی پیرائے اختیار کرتا ہے مگر مطمئن نظر نہیں آتا۔ اس کے پاس بات کرنے کے کئی طریقے ہیں مگر یوں لگتا ہے کہ اسے ابھی بہت سی باتیں کرنی ہیں۔ غزل ہو یا نظم، اصل مسئلہ کچھ کہنا ہے اور رضیہ بہت کچھ کہنا چاہتی ہے۔

وہ ایک حوصلہ مند خاتون ہے۔ اس نے زندگی میں بہت سے خواب دیکھے، کئی خیال بکھیرے، بہت کچھ اَن کہا رہنے دیا، بہت سی لائنیں اور مصرعے قلم زد کیے، بہت سے لفظ لکھ کر مٹائے اور بہت سی سرگوشیاں ہونٹوں کی جنبش میں دفن کیں۔ ہم جان سکتے ہیں کہ بحیثیت شاعرہ اسے کتنے کٹھن مراحل سے گزرنا پڑا ہوگا مگر اس کے باوجود اس نے کئی خواہشوں، حسرتوں، بے نور صبحوں، تاریک راتوں، آہوں اور کرچی کرچی خوابوں کا حساب مانگا ہے۔ یہ درست ہے کہ ابھی اس کے سوالات کا جواب ملنے کا وقت نہیں آیا۔ مگر سوال کرنے کا بھی ایک وقت ہوتا ہے اور رضیہ نے اس وقت کو پہچان لیا ہے۔ اس نے عورت کی تمام حیثیتوں کو معتبر بنایا ہے۔ اس کا احساسِ ذات بھی محض ذاتی نہیں بلکہ اس عورت کا احساسِ ذات ہے جو چادروں اور چار دیواریوں میں تحفظ کے نام پر غلام بنائے جانے کی قطعاً تمنا نہیں رکھتی۔

اس کو ملکی اور غیر ملکی حدوں میں جس طرح انسان کی بجائے ''مال'' سمجھ کر اِدھر اُدھر کیا جارہا ہے وہ اسے کسی طرح بھی قبول نہیں۔ آج عورت اگر اپنا اصل حوالہ مانگتی ہے تو حقوق کی جدو جہد میں وہ اکیلی نہیں، وہ تمام آوازیں اس کے ساتھ ہیں جن کا دُکھ رضیہ کے ان لفظوں میں ڈھل چکا ہے:

اے کاش سرِ صحرا اک پھول کھلا ہوتا
اس پھول کے پہلو میں اک دیپ جلا ہوتا

رضیہ کو اچھی طرح معلوم ہے کہ جس روز پھول کھل گیا، صحرا، صحرا نہیں رہے گا، گلشن بن جائے گا اور اس گلشن میں رضیہ اپنی سکھیوں سمیت جتنے دیپ چاہے جلا سکے گی۔

زاہد مسعود
(لاہور)

عورت، خوشبو اور نماز

رضیہ اسماعیل کی نثری اور شعری تحریریں پڑھ کر ایک واضح تاثر بنتا ہے جسے میں کچھ یوں بیان کروں گی کہ جب لڑکی کی شادی ہو جائے، چاہے وہ کسی فقیر سے ہو، بادشاہ سے ہو، گلی محلے میں ہو یا کسی دور دراز شہر میں یا ملک میں ہو جائے، مگر عورت کے دل سے میکہ کبھی نہیں نکلتا۔ میکہ اس کے اندر یوں بسا رہتا ہے جیسے کعبے کی فضاؤں میں دعائیں رہتی ہیں۔ میکے کا تصور اس کے دل کا طواف کرتا رہتا ہے۔ رضیہ کی شاعری میں دو تصورات بڑے واضح ہیں۔ یعنی ایک میکے کا تصور اور دوسرا پاکستانیت۔ اب جب کہ رضیہ اسماعیل برطانیہ میں رہتی ہیں تو پاکستان ان کا میکہ ہے۔ ان کی پوری شاعری اپنی زمین اور اپنی مٹی سے جڑی ہوئی ہے۔ جب وہ اپنی زمین اور مٹی سے جڑی ہوئی شاعری کرتی ہیں تو پھر انھیں زمین کے ساتھ لگی ہوئی اپنی عورت نظر آتی ہے۔ اور وہ عورت کے جذبات و احساسات کو ایک عورت بن کر بیان کرتی ہیں۔ رضیہ اسماعیل کو عورت ہونا اچھا لگتا ہے۔ انھوں نے اپنی نثر یا شاعری میں کہیں یہ نہیں کہا کہ کاش میں عورت نہ ہوتی۔ عورت ہونا ایک بہت خوب صورت بات ہے۔ ہمارے پیارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ مجھے آپ کی دنیا میں عورت، خوشبو اور نماز پسند ہے۔ یہ بات اسی ترتیب سے کہی گئی ہے۔ اپنی کم علمی کے باوجود جب میں غور وخوض کرتی ہوں تو مجھے عورت کے سلسلے کی ساری وضاحتیں، خوشبو اور عبادت سے جڑی ہوئی نظر آتی ہیں۔ کیوں کہ عورت جہاں بیٹھتی ہے، اپنے وجود کی، اپنے کردار کی خوشبو لے

کر بیٹھتی ہے۔ جس گھر کو آباد کرتی ہے، عبادت کے ساتھ آباد کرتی ہے اور وہ گھر عبادت گاہ بن جاتا ہے۔

اب سوال یہ ہے کہ عورت کا دکھ کیا ہے؟ ''میں عورت ہوں'' کے پیش لفظ میں رضیہ لکھتی ہیں: ''عورت کی جسمانی ضرورتیں پوری کر کے ہم سمجھ لیتے ہیں کہ فرض ادا ہو گیا۔ مگر نمازوں میں فرضوں کے ساتھ سنتیں اور نوافل بھی ہوتے ہیں۔'' میں ان کے بہت گہرے فقرے کے جواب میں یہ کہوں گی کہ زیادہ تر لوگ تو فرض نمازیں ہی ادا نہیں کرتے تو سنت اور نوافل کی فکر کون کرے گا؟

ایک مرتبہ ایک غیر ملکی سفر میں کسی کانفرنس کی غرض سے جاتے ہوئے ایک مولانا صاحب سے عورتوں کے حقوق کی بات چل نکلی تو انھوں نے ایک خوب صورت بات کہی کہ آپ پاکستان یا دنیا بھر میں عورتوں کے حقوق کی بات کرتی ہیں۔ میں کہتا ہوں کہ پاکستان کے اندر جس عورت کو اس کے شوہر نے کبھی تھپڑ نہیں مارا اس عورت کے سارے حقوق ادا ہو گئے۔ یہ اتنا دردناک فقرہ تھا کہ جس پر میں نہ ہنس سکتی تھی اور نہ رو سکتی تھی۔ رضیہ نے بھی بہت ہی خوبصورت باتیں اور بہت سے خوب صورت اشعار لکھے ہیں جن پر نہ ہنس سکتے ہیں اور نہ رو سکتے ہیں۔

میرے خیال میں ہمیں اب اس مقام سے نکل کر اکیسویں صدی کی بات کرنا ہوگی۔ اگر دیکھا جائے تو عام طور پر ہمیں دو قسم کی عورتیں ملیں گی۔ ایک مجبور، محکوم اور پسی ہوئی عورت اور دوسری باغی عورت۔ مگر جس عورت کی بات رضیہ اسماعیل کر رہی ہیں وہ نہ مجبور ہے نہ مظلوم، نہ محکوم بلکہ وہ اصلی عورت ہے۔ وہ عورت کا اصلی چہرہ ہے جو اگر ماں ہو تو قدموں تلے جنت ہے، بیوی ہو تو شوہر کو سر تاج سمجھتی ہے۔ بہن ہو تو بھائی اس کا غرور ہے اور بیٹے کو دل کا سرور سمجھتی ہے۔ وہ ان چاروں حوالوں کو خوشی کے حوالے کہتی ہے مگر سوال یہ ہے کہ عورت کے یہ چاروں حوالے اس کے حقوق کی بات کہاں تک کرتے ہیں؟ عورت کو

درد کی دولت ملی ہے اور کچھ وافر ہی ملی ہے۔ اب اگر قدرت نے یہ دولت عورت کو عطا کر ہی دی ہے تو پھر قدرت سے کیا کہنا۔ اس کا انعام سمجھ کر اپنے پاس رکھ لینا چاہیے۔

رضیہ اسماعیل کی ساری کی ساری شاعری خوب صورت ہے جس میں شدتِ احساس ہے۔ ایک عجیب سا انتظار ہے، ایک گہری اداسی ہے جو زندگی کے ساتھ ساتھ چلتی ہے۔ اس طرح جیسے کوئی چیز دوپٹے کے پلو سے باندھ کر گرہ لگائی جائے تا کہ ہمیشہ یاد دلاتی رہے کہ تمھیں اداس بھی رہنا ہے۔ ان کی پوری شاعری میں کہیں منافرت نہیں ہے، کہیں منافقت نہیں ہے، کہیں نفرت نہیں ہے۔ انھوں نے اس قسم کی باغیانہ شاعری نہیں کی۔ انھوں نے چاند، سورج اور ستارے نہیں مانگے۔ صرف اپنے وجود کی شناخت مانگی ہے۔ اپنا آپ گھر کی دہلیز کے اندر مانگا ہے جو ہر عورت مانگتی آئی ہے، جو اس کا حق ہے اور اس صدی کے مردوں کو وہ شعور ہے کہ اسے اس کا حق دے سکیں۔

دو حصوں میں بٹی ہوئی عورتوں کے قبیلے میں ہم لکھنے لکھانے والی عورتیں اس پس ماندہ عورت کی بات کرتی ہیں۔ اگر ہم اس عورت کی بات نہیں کریں گی تو پھر کون کرے گا؟ ایسی عورت کے حق کی بات بھی ہمیں ہی کرنی ہے جسے علی الصبح چوٹی سے پکڑ کر اٹھایا جاتا ہے اور رات کو لات مار کر سلایا جاتا ہے۔ ان کی بات بھی ہمیں دوسروں تک پہنچانی ہے۔ اس مرد کے اندر روشنی بھی ہمیں ہی جگانی ہے۔ جب ہم ایسی چیزیں لکھیں گی اور دوسروں تک پہنچیں گی تو معلوم ہوگا کہ عورت کیا مانگتی ہے۔ اس نے بے مہار آزادی تو نہیں مانگی۔ اگر اس نے محبت کی ہے اور فنا ہونے کی ڈگر پر چلی ہے تو کہہ رہی ہے کہ میں تو خود ہی فنا ہونے کے لئے بنی ہوں۔ تم کیوں فنا کرتے ہو؟ دراصل محبتوں میں بھی کچھ لین دین ہوتا ہے جو عورتوں کے معاملے میں مردوں کی طرف سے کم ہی دیکھنے میں آیا ہے۔ علامہ اقبال نے کہا ہے کہ ”یہ آگہی میری مجھے بے قرار رکھتی ہے“...... رضیہ اسماعیل کے پاس آگہی بھی ہے، خوب صورت تحریر بھی ہے، محبت ہے، شدتِ احساس ہے۔ ان کی شاعری میں جو سادگی، سچائی اور

احساسِ آگہی ہے وہ سیدھا دل پر جا لگتا ہے۔ انھوں نے بہت سی خوب صورت نظمیں اور اشعار کہے ہیں۔ مثلاً ان کی ایک نظم تحریر کرتی ہوں:

تحریر

لکھو، اتنا لکھو
یہ زندگی تحریر بن جائے
کسی کاغذ کے ٹکڑے پر
کوئی بگڑی ہوئی تقدیر بن جائے!
لکھو ایسے کہ حرفوں سے
کسی ماہر مصور کی کوئی تصویر بن جائے!
ترے لفظوں میں وہ تاثیر ہو
جو پاؤں کی زنجیر بن جائے!
انڈیلو دل کا سارا درد
تم کاغذ کے ٹکڑوں پر
کوئی فقرہ قلم سے روٹھ کر کچھ اس طرح نکلے
کسی نادیدہ کل کی قیمتی جاگیر بن جائے!

ایک اور نظم ''تجھے دنیا میں رہنا ہے'' میں محبت جب شکوہ کرتی ہے کہ میں دنیا میں کیوں آئی تو جواب دیتی ہیں کہ:

کہا میں نے محبت تو بہت نازک
بہت پاکیزہ جذبہ ہے
یہ اتنی تلخیاں لے کر بہت سے دُکھ سمیٹے

کیسے اب خالق سے تو نظریں ملائے گی

ترا مذہب نہیں نفرت

زمانہ تجھ سے کتنا تلخ ہو جائے

تجھے نفرت کے گھر میں قید کر ڈالے

تمھاری نوچ لے آنکھیں

تمھیں برباد کر ڈالے

ترے تن پر، ترے من پر

ہزاروں زخم آ جائیں

تو چاہے کتنی گھائل ہو

تجھے دنیا میں رہنا ہے

سبھی کا درد سہنا ہے

یہی تقدیر ہے تیری

یہی حکمِ الٰہی ہے!

ایک شعر یاد آرہا ہے کہ:

کس جبر میں جیتی ہے مرے دیس کی عورت

تھوڑی سی سہی ، دادِ وفا کیوں نہیں دیتے

بس تھوڑی سی دادِ وفا، تھوڑی سی محبت کی طالب ہے۔ کیوں کہ خود عورت کے پاس وفا اور محبت کے ضمن میں دینے کو بہت کچھ ہے۔ وہ سخی ہے، دریا دل ہے مگر تھوڑی سی بات کہیں اٹکی ہوئی ہے۔ عورت کو محبت کرنے کو، سخاوت کرنے کو، اپنی روشنیاں بکھیرے دینے کو، اپنے آپ کو لٹا دینے کو، گھروں کو آباد کر دینے کو، رسوئی میں خوشبو پھیلا دینے کو۔ اس کا کام یہ

نہ سمجھا جائے کہ وہ بس اسی سب کچھ کے لئے پیدا ہوئی ہے۔ یہ سب اس نے اپنی مرضی، اپنی رضا سے حاصل کیا ہے، تسلیم کیا ہے، مگر ایک بات ضرور ہے کہ سارے ہنستے بستے گھر صرف عورت کے دم ہی سے آباد ہیں۔ جہاں عورت اکڑ گئی، گھر آباد نہیں ہوئے۔ جہاں عورت نے برضا ورغبت سر جھکایا ہے، سر گرایا ہے، انہی گھروں میں سرِ شام خوشبودار دھواں اٹھتا ہے۔ پکوان پکتے ہیں اور سارے مرد دوڑ دوڑ کر گھروں کو واپس جاتے ہیں۔ سارے گھر اگر عورت کی وجہ سے آباد ہیں تو سارے شہر مردوں کی وجہ سے آباد ہیں۔ ان عورتوں نے مردوں کو تسلیم کر کے ثابت وسالم کھڑا کر دیا ہے ستونوں کی طرح۔ یہ عورت صبح دم اپنے گھر کا دروازہ کھول کر کہتی ہی کہ جاؤ اور سارے زمانے سے لڑو۔ میں سارا دن تمھارے بچوں کے ساتھ پگھلوں گی اور جب تم سرِ شام آؤ گے تو موتیوں کے ہار گوندھ کر تمھارا استقبال کروں گی۔ جس گھر میں شام کو شوہر نہیں آتا وہ گھر بڑا اداس ہوتا ہے۔ اس گھر کے در و دیوار روتے ہیں۔ اس گھر کے بچے چیختے ہیں۔ اس گھر کی عورت کے ماتھے پر کئی شکنیں ہوتی ہیں۔ یہ آمد و رفت کا عجیب سلسلہ ہے کہ عورت صبح دونوں ہاتھوں سے جسے دنیا کے حوالے کرتی ہے، شام کو وہ اپنے سلگتے سانسوں کے ساتھ اسے وصول کرنا چاہتی ہے۔ گھر کو سجاتی ہے، سنوارتی ہے، یہ گھر ہی اس کی کائنات ہے۔ اس کا سب کچھ ہے۔ جب گھر کے اندر گھر والا آ جاتا ہے تو یہی گھر جنت کا نمونہ بن جاتا ہے۔ مگر بہت سے گھر ایسے بھی ہیں جہاں مرد کہتے ہیں کہ نہ دوں تو تجھے روٹی نہ ملے۔ میں نہ دوں تو تجھے کپڑا نہ ملے اور چاہوں تو چوٹی سے پکڑ کر باہر نکال دوں۔ یہ ڈرامے ہر روز ہوتے رہتے ہیں۔ یہ سب چھوٹی چھوٹی باتیں، چھوٹے چھوٹے حادثے، رنجشیں بن جاتی ہیں۔ چھوٹی چھوٹی باتوں سے دوستی جاتی رہتی ہے مگر یہ رنجشیں، یہ فقرے گھروں کا سکون لے جاتے ہیں۔ ہم ساری عورتیں جنھیں اللہ تعالیٰ نے روشنی عطا کی ہے اور وارثوں کی تائید ملی ہے، علم و آگہی کی مشعل لے کر نکلی ہیں تا کہ دلوں کو

دلوں سے جوڑ دیں۔ گھروں کو گھروں سے جوڑ دیں۔ رنجشیں بھول جائیں اور دکھ نہ دینے کا ارادہ کریں۔ کیوں کہ ایک دل ٹوٹتا ہے تو ایک گھر ٹوٹتا ہے، ایک گھر ٹوٹتا ہے تو ایک خاندان ٹوٹتا ہے۔ ایک خاندان ٹوٹتا ہے تو ایک محلّہ ٹوٹتا ہے۔ ایک محلّہ ٹوٹتا ہے تو ایک شہر ٹوٹتا ہے۔ اور ٹوٹنے کے یہ سلسلے بہت دور تک نکل جاتے ہیں۔ بات سوچنے کی ہے اور ہم سب کو مل کر سوچنا چاہیے کہ ہم آج تک ایک قوم کیوں نہیں بن سکے۔ میں کہتی ہوں کہ تم عورتوں کو گھروں کے اندر عزتِ نفس دے دو، محبت کی چادر اوڑھا دو، اسے عورت پن دے دو، اس کی عزت کراوَ، قوم ایک قوم بن جائے گی۔ جب عورت کو گھر کے اندر قبول نہیں کیا جاتا، اسے یہ سب کچھ نہیں ملتا تو وہ اپنی شناخت کے لئے گھر سے دور ہو جاتی ہے۔

ایک مرتبہ لاہور میں ٹریفک کے موضوع پر آئی جی پولیس سے بات ہو رہی تھی تو میں نے کہا کہ عورتوں کو عزتِ نفس دے دیں، ہماری ٹریفک ٹھیک ہو جائے گی۔ وہ حیرانی سے پوچھنے لگے کہ وہ کیسے ہوگا؟ میں نے کہا کہ گھروں میں چار، چھ، آٹھ یا دس بچے ہوتے ہیں۔ ہم بھی بہت بہن بھائی تھے۔ گھر کی ساری ٹریفک کا انتظام ماں کے ہاتھ میں تھا۔ وہ سکھاتی تھی کہ ٹریفک درست کیسے رکھنی ہے، کون کہاں بیٹھے گا، کھانا کس کو پہلے ملے گا، روٹی کون بنائے گا، برتن کون صاف کرے گا، باپ کے آگے کون چیز رکھے گا، سکول جانے سے پہلے کیا ہوگا، سکول سے آکر کیا ہوگا تو یہ سب ٹریفک گھر میں پہلے ماں سکھاتی تھی۔ اب لوگ ماں کو بھول گئے ہیں، اسے تلاش نہیں کرتے، ماں کو نہیں ڈھونڈتے، اس کے قدموں تلے جنت بھی نہیں کھوجتے، اس کے پیچھے پیچھے نہیں دوڑتے۔ اب تو صرف رکشے کے پیچھے لکھا ہوا نظر آتا ہے...... ''ماں کی دعا، جنت کی ہوا'' اور ماں رکشے کے پیچھے پھرتی رہتی ہے۔ ابھی ہمیں ماؤں کی بہت ضرورت ہے۔ گداز دل، محبت کرنے والی مائیں اور جب یہ سب کچھ نہیں ہوگا تو رضیہ اسماعیل بھی ایسی اداس شاعری نہیں کرے گی۔ مثلاً

سُکھ کا دُکھ

میں دُکھ کے راستے پر
چلتے چلتے تھک گئی ہوں اب
مرے پاؤں کے چھالے
ہر گھڑی فریاد کرتے ہیں
کسی دُکھ میں چھپے
چھوٹے سے سُکھ کو یاد کرتے ہیں
مرے اندر کی وہ سہمی ہوئی عورت
مقید جسم کے تاریک کمرے میں
پھٹی آنکھوں سے ہر لمحہ
کوئی کھڑکی، کوئی دروازہ
کھلنے کی صدا کی منتظر
اب تھک گئی ہے

بشریٰ رحمٰن

(لاہور)

(لاہور میں بشریٰ رحمٰن کی صدارت میں رضیہ اسماعیل کی کتابوں کی رسمِ اجرا کی تقریب کا خطبۂ صدارت)

چشمِ نم......چشمِ حیراں

رضیہ سے میری ملاقات زیادہ پرانی نہیں مگر یہ آنکھوں کا ہی کمال ہے جس سے ہم نے ایک دوسرے کا پہچانا۔ جانے رضیہ کو میری آنکھوں میں کیا نظر آیا۔ یا مجھے رضیہ کی آنکھیں بولتی اور جاگتی ہوئی محسوس ہوئیں۔ بہر حال آج ہم دونوں متلاشی آنکھوں کے اس تصادم کے راز سے واقف ہو چکے ہیں۔ شاید کوئی دوسرا نہ جان سکے۔

''آنکھیں'' ایک لفظ ہے مگر اس کے اندر معانی کی ایک پوری دنیا آباد ہے۔ رضیہ اسماعیل نے زیرِ نظر مجموعۂ کلام میں مشاہدے کی آنکھ سے حاصل شدہ تمام تر موضوعات کو گرفت میں لا کر کٹھا کرنے کی کوشش کی ہے۔ چشمِ بینا اور چشمِ بصیرت رکھنے والی رضیہ کچھ عرصہ قبل ''گلابوں کو تم اپنے پاس رکھو'' کہہ کر شاعری کی وادیٔ پُر خار میں آبلہ پائی کے لئے قدم رکھ چکی ہیں۔ اس وادیٔ پُر خار میں داخل ہونے کے بعد اس نے اپنے جذبات اور محسوسات کو، جو مستعار نہیں لیے جا سکتے بلکہ مشاہدے اور تجربے سے حاصل ہوتے ہیں، ایک نیا رنگ دیا۔ آہنگ بے شک پرانا ہے۔

رضیہ اسماعیل جو ایک عورت ہے، ایک ماں ہے، سراپا درد ہے۔ ہر درد، ہر کرب اس کو ممتا نے بخشا ہے، جو تخلیق کار ہے اور تخلیق بنا کرب کے ناممکن ہے۔ درد نے اس کو چشمِ نم اور چشمِ حیراں عطا کی ہے۔ نمی کے اس جھلملاتے سمندر میں منظر اور پس منظر کبھی واضح ہو جاتے

ہیں، کبھی دھندلا جاتے ہیں۔ تصویریں بنتی اور بگڑتی رہتی ہیں۔ آہو چشم رضیہ چشمِ حیراں کے سہارے جستجو کے زینے تیزی سے طے کرتی ہوئی آگے بڑھ رہی ہے۔ تلاش منزل کی ہے یا اس سے بھی آگے کی یا منزل بے معنی ہے؟ جانے کیا ہے، جس نے اسے آمادۂ سفر کر رکھا ہے؟ وہ پابجولاں دشت نوردی پر نکلی ہے۔ راستے میں بکھرے ہوئے کانٹے، کنکر، کرچیاں اس کو زخمی کر رہے ہیں۔ تاریک راہوں کے اندر کی روشن آنکھ متلاشی رضیہ کے ساتھ قطب ستارے کی طرح ہے۔ اس سفر میں اس کی چشمِ بینا نے کیا کیا نہ دیکھا۔ تلخیاں، دُکھ کے پھیلے ہوئے ساگر، یہاں تک کہ تلخ حقیقتوں کی کڑواہٹ اس کے اندر تک سرایت کر گئی۔ ظلمتوں نے اس کی باطن کی آنکھ کو روشن کر دیا اور سب کچھ اس کے اندر مٹ آیا۔ باطن روشن ہوا تو آنکھ میں وسعت آ گئی اور آخر رضیہ یہ کہنے پر مجبور ہو گئی کہ

"سب آنکھیں میری آنکھیں ہیں"

یہ مصرعہ اس کو دورانِ تلاش چشمِ حیراں نے عطا کیا۔ اس کی روشن آنکھ نے اپنی ہم جنس کے وہ روپ اور انداز دیکھے کہ جذبات میں طوفان آ گیا۔ اس جوار بھاٹے میں رضیہ ڈوبتی رہی، پگھلتی رہی اور آہستہ آہستہ اس نے گرداب میں سنبھلنے کا سلیقہ سیکھ لیا۔ ظاہری ٹھہراؤ نے اس کے اندر تلاطم برپا کر دیا اور یہ تلاطم کبھی الفاظ کا خوب صورت اور کبھی کٹھو رجامہ پہن کر صفحۂ قرطاس پر بکھرنے لگا اور بکھرتا ہی چلا گیا۔ اور اب یہ بہاؤ اس قدر تیز ہے کہ اب اس کو روکنا شاید رضیہ کے بس کی بات بھی نہیں۔ غمِ جاناں اور غمِ دوراں جس کا مشاہدہ اس نے پاکستان میں اور پھر برطانیہ میں بھی کیا، اس کو درد آشنا کرتا چلا گیا۔ لامتناہی کرب جو غمِ دوراں غمِ جاناں سے حاصل ہوا، اس نے رضیہ کو بہادر بھی بنا دیا اور زبان بھی عطا کی۔ مگر مایوسی، مظلومیت اور دُکھ کا عنصر اس کے رگ و پے میں سرایت کر گیا۔ عورت کی

بے چارگی کا یہ دُکھ اس کی شاعری میں جا بجا بکھرا نظر آتا ہے۔ظلم کی چکی میں پسی ہوئی عورت سوچ کے بادبان بھی کھولتے ہوئے ڈرتی ہے۔

سوچ کے بادباں

اس ہوا

اس فضا میں

کھلیں بھی تو کیسے کھلیں

مجھ کو تو ہی بتا

رضیہ کو دنیا عقوبت خانہ نظر آتی ہے تو عقوبت خانے جیسی نظم سامنے آتی ہے۔رضیہ کی شاعری میں بدلتے موسموں کے رنگ بھی نظر آتے ہیں۔لیکن اس میں خزاں اور ساون کی رُت نمایاں ہے۔ بہار رنگ کم کم نظر آتے ہیں ۔مایوسی کا عنصر زیادہ ہے، امید کی کرن دھندلی ہے۔ کرب اور دُکھ کے بادلوں کی دبیز تہہ میں لپٹے لپٹائے موضوعات اس کی شاعری کا حصہ ہیں۔آنکھ کا استعارہ کئی جگہ استعمال ہوا ہے اور اس کی اکثر نظموں کا عنوان یہی ہے۔جیسے:

آنکھیں

آنکھ شرمندہ ہے

بدن میں آنکھ

سب آنکھیں میری آنکھیں ہیں

متلاشی آنکھیں

''بادبان''، ''آسمان'' اور ''زنداں'' کے استعارے اس نے زمانے کے نارواروییے سے اخذ کیے ہیں...... شاعری کا انداز گفتگو کا سا ہے۔ اس میں خود کلامی بھی اور اندازِ تخاطب بھی ہے۔ تمام شاعری عورت کی ذات کے گرد گھومتی نظر آتی ہے۔ ایسی عورت جو مجبور ہے، مظلوم ہے، محبوس ہے۔ مگر رضیہ جی! میرا پُر خلوص مشورہ ہے کہ اب عورت کو اپنی وہ چنری، جس میں دھوپ باندھ دی گئی ہے، سائباں بنا کر، علَم بنا کر سامنے آنا ہے۔ چودہ سو سال قبل جو آزادی ہمیں ملی تھی، اس حق کو استعمال کرنا ہوگا۔ ہم اپنا استحصال نہیں ہونے دیں گے۔ ہم عقوبت خانوں میں رہنے کے لئے پیدا نہیں ہوئے۔ ہم تو وہ ہیں جن کے قدموں تلے جنت ہے اور یہ بات ہمیں بانگِ دہل منوانا ہوگی۔ اور آج سب کے سامنے برملا اپنی بات کہنا، رائے دینا، اس چیز کا بیّن ثبوت ہے کہ اب تعمیر کی طرف ہمارے بڑھتے ہوئے قدم روکنا کسی کے بس کی بات نہیں۔ اور یہاں میں اپنا ایک شعر تمھاری وساطت سے آج کی عورت کی نذر کرتی ہوں۔

ہماری سوچ پر پہرے بٹھاؤ تم تو ہم جانیں
بندھے ہاتھوں سے زندہ لفظ ہم تحریر کرتے ہیں

رضیہ جی اس دفعہ پاکستان میں زندگی کا کچھ سفر تم نے میرے ساتھ طے کیا ہے۔ اب تم ذات کی دہلیز پار کر کے عرفانِ ذات کے عمل سے گزر رہی ہو۔ عرفانِ ذات نے تمھیں ذوقِ آگہی بخشا ہے اور تمھاری باطن کی آنکھیں مزید روشن ہوگئی ہیں۔ یہ روشن آنکھیں روشن ستارے بن کر تمھارے ظلمت کدۂ شب کو درخشندہ کر دیں گے۔ دُکھ سمیٹنے پر سُکھ کے حسین مناظر تمھاری آنکھوں کو مزید جِلا بخشیں گے۔ تم خود جان لوگی کہ دعا محبت ہے اور نفرت بددعا ہے، محبتوں کی پیامبر بن کر دنیا میں محبتیں تقسیم کرتی رہو، کرتی رہو! صلے کی پروا کیے بغیر۔ پھر میں کہوں گی:

سب آنکھیں تیری آنکھیں ہیں

سب سپنے تیرے سپنے ہیں

جب دُکھ بانٹے گی سب کے تو

سب سُکھ بھی تیرے اپنے ہیں

دعا گو

ڈاکٹر شہناز مزمل

۱۲؍ربیع الاول......۱۶جون ۲۰۰۰ء

۱۲۵؍ایف ماڈل ٹاؤن لاہور

رضیہ اسماعیل کی ماہیا نگاری

اُردو میں ماہیا نگاری کی جتنی مخالفت ہو رہی ہے اتنی ہی اسے مقبولیت حاصل ہو رہی ہے۔تھوڑا عرصہ پہلے برمنگھم میں ممتاز ادیب اور صحافی محمود ہاشمی سے ٹیلی فون پر بات ہو رہی تھی۔ ماہیے کا ذکر ہوتو محمود ہاشمی نے بتایا کہ برمنگھم کی ایک شاعرہ اور مزاح نگار رضیہ اسماعیل بھی ماہیے کہہ رہی ہیں۔ مجھے اس خبر سے خوشی ہوئی تاہم ہلکا سا وسوسہ بھی رہا کہ یہ بھی کہیں عارضی قسم کی ماہیا نگار خاتون نہ نکلیں۔ جب ان سے رابطہ ہوا تو میرا وسوسہ دُور ہو چکا تھا۔وہ مجھ سے کسی رابطے کے بغیر محض ادبی تحریک سے اتنے ماہیے کہہ چکی تھیں کہ ان کا مجموعہ تیار ہو چکا تھا۔ جب رابطہ ہوا تو ان کا دوسرا ادبی کام سامنے آیا۔خواتین کی ادبی و ثقافتی تنظیم ''آگہی'' قائم کرنے کے علاوہ تخلیقی سطح پر ان کے کام کی کئی جہات ہیں۔غزلوں کا مجموعہ ''گلابوں کو تم اپنے پاس رکھو!''،طنزیہ و مزاحیہ مضامین کا مجموعہ ''چاند میں چڑیلیں'' اور نثری نظموں (نثرِ لطیف) کا مجموعہ ''میں عورت ہوں'' (اُردو،انگریزی میں ایک ساتھ) شائع ہو چکے ہیں۔شاعری کے بارے میں تو کوئی بات آگے ہوتی رہے گی۔ان کی نثر کے حوالے سے محمود ہاشمی کی رائے درج کرنا ضروری سمجھتا ہوں۔محمود ہاشمی لکھتے ہیں:

''شاعروں اور مشاعروں کی بالا دستی کے دور میں ایک شاعر کا نثر اور وہ بھی طنز و مزاح کی طرف متوجہ ہونا ایک خوش آئند بات ہے۔

رضیہ اسماعیل مبارک باد کی مستحق ہیں کہ انہوں نے نہ صرف نہایت سنجیدگی سے

معیاری شاعری کی ہے بلکہ نثر لکھ کر ثابت کر دیا ہے کہ اگر لکھنے کا ڈھنگ آتا ہو، مزاج میں اُپج ہو، طبیعت میں روانی ہو تو نثر میں برجستگی اور شگفتگی سے ایسی ایسی جادو بیانی کی جا سکتی ہے کہ اس پر کئی شعر قربان کیے جا سکتے ہیں۔

رضیہ اسماعیل نے نثر لکھ کر اِس فصیل کو بہت حد تک توڑ دیا ہے جو آج کے اکثر ادیبوں کے لاشعور میں نثر کی طرف جانے والے راستے میں ایک کوہِ گراں بن کر کھڑی رہتی ہے۔"

اب رضیہ اسماعیل کے ڈھیر سارے ماہیے ایک ساتھ پڑھنے کے بعد میرے سامنے رضیہ اسماعیل کی ایک اور جہت روشن ہے۔ ان کے ماہیوں میں ان کے خیالات، احساسات اور تلخ و شیریں تجربات کا بے ساختہ اظہار ہے۔ ایک طرف ان کے ماہیوں میں حمد، نعت، سانحۂ کربلا اور تکریمِ صحابہ سے متعلق ماہیے ملتے ہیں تو دوسری طرف انگلینڈ میں مقیم ہونے کے باعث یہاں کے ثقافتی ٹکراؤ اور اس سے پیدا ہونے والی صورتِ حال کو عمدگی سے اجاگر کیا گیا ہے۔ پہلے تبرک کے طور پر چند دینی ماہیے دیکھئے۔

تو باغ کا مالی ہے
تیری رحمت کا
جگ سارا سوالی ہے

ربّ کے احکام ہوئے
آقاؐ آپؐ کے ہم
بے دام غلام ہوئے

اک شاخ انجیر کی ہے
رشتہ مدینے سے
صورت زنجیر کی ہے

ہمیں تیرے سہارے ہیں
پیاس بجھا دینا
کوثر کے کنارے ہیں

دریا میں سفینہ ہے
ماہِ رمضاں تو
بخشش کا مہینہ ہے

معراج کی رات آئی
جھولیاں بھر لو تم
ربّ کی سوغات آئی

جب غم کی گھٹا چھائی
پیٹتی سر اپنا
کربل میں قضا آئی

پانی کا سوالی ہے
نانا نبیؑ جس کا
کوثر کا والی ہے

اشکوں سے وضو کر کے
ماہیے لکھتی ہوں
میں دل کو لہو کر کے

تو آمنہ جایا ہے
بی بی حلیمہ نے
تجھے دودھ پلایا ہے

دو فاطمہؓ جائے تھے
تو نے محبت سے
کاندھوں پہ بٹھائے تھے

بڑے دُکھ سُکھ ہوتے ہیں
تیرے پہلو میں
تیرے یار بھی سوتے ہیں

ان ماہیوں میں مذہبی محبت اور عقیدت کا رنگ غالب ہے۔لیکن مجھے مذہب سے یہ لگاؤ ایک طرح سے ثقافتی رنگ میں بھی محسوس ہوا ہے۔ انگلینڈ میں رہتے ہوئے جب ہمیں

اپنا دیسی معاشرہ اور ماحول یاد ہے تو اس کا مذہبی رنگ اس انداز سے اپنا جلوہ دکھاتا ہے۔ یوں بھی ثقافت کے ارضی رنگوں کے دوش بدوش آسمانی رنگوں کی آمیزش سے ہی کسی تہذیب کی تکمیل ہوتی ہے۔آسمانی رنگ میں مذہبی عقائد سب سے قوی اور موثر ہوتے ہیں۔

ثقافتی ٹکراؤ یا ثقافتی بحران کی وہ صورت جو برصغیر سے تعلق رکھنے والے، یورپ میں مقیم کم وبیش ہر فرد کو درپیش ہے، رضیہ اسماعیل نے اسے اپنے ماہیوں میں اتنی عمدگی اور خوب صورتی سے بیان کیا ہے کہ یہ گویا ہر دل کی آواز بن گئی ہے۔ایسے ماہیوں کی چند مثالوں سے میری بات بہتر طور پر واضح ہو سکے گی:

کڑوے ہیں سُکھ ماہیا
کس کو سنائیں اب
انگلینڈ کے دُکھ ماہیا

کلچر کا رونا ہے
آ کے ولایت میں
اب کچھ تو کھونا ہے

سب زخم چھپاتے ہیں
رہنے کا یورپ میں
ہم قرض چکاتے ہیں

یو کے میں بستے ہیں
کیسا مقدر ہے
روتے ہیں، نہ ہنستے ہیں

انگلینڈ کے میلے ہیں
جھرمٹ لوگوں کے
ہم پھر بھی اکیلے ہیں

ہیریں ہیں، نہ رانجھے ہیں
ہم نے ہوٹل میں
برتن بھی مانجھے ہیں

یورپ میں مقیم بعض دوسرے ماہیا نگاروں نے بھی یہاں کے مسائل کو عمدگی سے اپنا موضوع بنایا ہے لیکن ایسا انداز کہ جس سے ہم لوگوں کا ثقافتی بحران اور اس مسئلے کی داخلی کیفیات نمایاں ہوسکیں، اس کو رضیہ اسماعیل نے ایسی بے ساختگی سے بیان کیا ہے کہ یہ ان کی انفرادیت بن گئی ہے۔ ایسی انفرادیت جس میں پورے اجتماع کی ترجمانی یا عکاسی موجود ہے۔ یورپی زندگی کی بعض نجی اور اجتماعی نوعیت کی ملی جلی مثالیں بھی دیکھتے چلیں:

کس دیس میں رہتے ہیں
بچے پیرنٹس کو
یہاں شَٹ اَپ کہتے ہیں

دادا ہے، نہ دادی ہے
پکڑ کے ڈیڈی نے
شادی کروا دی ہے

یہاں کون ہمارا ہے
سردی دشمن ہے
ہیٹر کا سہارا ہے

کونجوں کی ڈاریں ہیں
بینیفِٹ آفس میں
بڑی لمبی قطاریں ہیں

مغرب میں رہنے والی ایک پاکستانی عورت کی حیثیت سے ماہیا نگاری کرنے والی رضیہ اسماعیل نے ماہیے کے عمومی موضوعات کو بھی چھوا ہے لیکن ان میں دوسروں میں شامل رہنے کے باوجود ان سے ہٹ کر بات کرنے کی کوشش کی ہے۔ کشمیر کے موضوع پر پاکستان اور انڈیا میں الگ الگ رائے پائی جاتی ہے اور دونوں طرف سے ماہیا نگاروں نے اپنے اپنے موقف کا اظہار کیا ہے۔

رضیہ اسماعیل نے بھی کشمیر کے حوالے سے دو ماہیے کہے ہیں اور ان میں ایک پاکستانی کی حیثیت سے اپنے موقف کا اظہار کیا ہے۔ تاہم ان کا یک ماہیا اتنا عمدہ ہے کہ اس کی داد انڈیا کے ادبی ذوق رکھنے والے بھی دیں گے۔

کشمیر کی وادی ہے
جائے کوئی روکے
یہ جبری شادی ہے

مجھے لگتا ہے کہ یہ ماہیا لکھتے وقت بھی رضیہ کے لاشعور میں یورپی کلچر سے ٹکراؤ کا عمل جاری تھا۔ یہاں بعض والدین نے جس طرح بچوں کی شادیاں جبراً کرنے کی کوشش کی اور

اس کے نتیجے میں جو تلخ مسائل پیدا ہوئے، رضیہ کے ہاں کشمیر کی سیاسی صورتِ حال پر اپنے پاکستانی جذبات کا اظہار کرتے ہوئے لاشعوری طور پر ان کا اظہار ہوا ہے۔ تاہم یوں بھی نہیں کہ صرف یورپ اور مشرق کے ٹکراؤ تک ہی محدود ہو کر رہ گئی ہے۔ ان کے ہاں ماہیے کا وہ رنگ بھی نمایاں ہے جو پنجاب کا رنگ کہلاتا ہے۔ ان کے ایسے ماہیے دیکھیں:

میں لہر چناب کی ہوں
غیرت بھائیوں کی
بیٹی پنجاب کی ہوں

اک لڑکی گاؤں میں
ماہیے لکھتی ہے
پیپل کی چھاؤں میں

اک نہر کنارہ ہے
گاؤں کا ہر ذرّہ
مجھے جان سے پیارا ہے

بیلوں کی جوڑی ہے
اس نے شرارت سے
میرے گاگر توڑی ہے

فصلوں کی کٹائی ہے
ساگ پراٹھے ہیں
کہیں دودھ ملائی ہے

ہاتھوں میں لکیریں ہیں
پاؤں میں شوگر کی
میٹھی زنجیریں ہیں

عورت کے حقوق کا موضوع رضیہ اسماعیل کا خاص موضوع ہے جو ان کی غزلوں، نظموں سے لے کر طنزیہ مزاحیہ مضامین تک نمایاں ہے۔ ان کے ماہیوں میں بھی اس موضوع کو آنا تھا، سو آیا۔

عورت کو ستاؤ گے
جنم جلی ہے جو
کیا اس کو جلاؤ گے

یہ دیئے کی باتی ہے
قدر کرو اس کی
دکھ سکھ کی ساتھی ہے

عورت کو دغا دو گے
بیوی بنا کر تم
چولھے میں جلا دو گے

کمھار کا آوا ہے
پکتا رہتا ہے
میرے دل میں جو لاوا ہے

شبنم کا قطرہ ہے
تنہا عورت کو
ہر طرف سے خطرہ ہے

رضیہ اسماعیل نے اپنی ماہیا نگاری سے ماہیے کی تحریک کو تقویت پہنچائی ہے۔ انگلینڈ کے مشاعروں سے لے کر بی بی سی ایشیا کے اُردو ادبی پروگراموں تک اُردو ماہیا کو ادبی وقار کے ساتھ متعارف کرایا ہے۔ اب ان کے ماہیوں کا مجموعہ چھپنے جا رہا ہے تو مجھے دلی خوشی ہو رہی ہے۔ ان کے ماہیے ان کے دل کی کہانی ہیں۔ اگر چہ انھوں نے یہ کہا ہے۔

یہ دل کی کہانی ہے
کوئی نہیں سنتا
اب خود کو سنانی ہے

لیکن مجھے یقین ہے کہ اس مجموعہ کی اشاعت کے بعد ماہیے کے قارئین اس کہانی کو دل چسپی سے پڑھیں گے۔ کیوں کہ یہ صرف رضیہ اسماعیل کی اپنی ہی نہیں، ہر صاحبِ دل کی کہانی ہے۔ ماہیا ''کتابِ دل'' ہی تو ہے۔ بہر حال رضیہ اسماعیل کے اس مجموعے کا دلی خوشی کے ساتھ خیر مقدم کرتا ہوں۔

حیدر قریشی
(جرمنی)
۲۷/جنوری ۲۰۰۱ء

ایک حوصلہ مند شاعرہ

بچپن میں والدین کی دی ہوئی تعلیم زندگی بھر کے لئے مشعلِ راہ بنی رہتی ہے۔ رضیہ اسماعیل کے والدین نے بھی انھیں بچپن میں حوصلہ مند رہنے اور سچ بولنے کی تعلیم دی تھی۔ رضیہ اسماعیل نے اس پر ہمیشہ عمل کیا۔ گو بقول رضیہ، اس خوبی نے انھیں بہت دکھ دیئے مگر انھوں نے ریاکاری اور منافقت سے کبھی سمجھوتا نہیں کیا۔ جو سچ جانا، اسے ببانگِ دُہل کہا اور یہی رویہ اس نے اپنی شاعری میں بھی اپنایا۔ مثلاً

جوان چہرے لٹے لٹے سے، نظر کی شمعیں بجھی بجھی سی
نشے سے اجڑی جوانیوں کو میں کیسے عہدِ شباب لکھوں

رضیہ اسماعیل کے ذہن پر بچپن کے تاثرات بہت گہرے ہیں۔ گاؤں کی کھلی فضا، لہلہاتے کھیت، بہتی ندیاں، تاروں بھری راتوں کی مسحور کن فضا میں بالخصوص تہجد کے وقت ان کے والد کے ''اللہ ہُو'' کے دل کش وِرد نے رضیہ کو بہت متاثر کیا۔ کم سن لڑکی رضیہ کے ذہن میں اس کے اطراف ونواح کے ماحول سے جنم پانے والے سوالات نے اس میں غور و فکر کی عادت ڈال دی۔ لیکن ان کا جواب اسے بہت بعد میں ملا۔

رضیہ اسماعیل نے صنفِ شاعری میں غزل کے ساتھ نظم (آزاد، پابند اور نثری) کے علاوہ ماہیے اور دوہے بھی لکھے ہیں۔ ''گلابوں کو تم اپنے پاس رکھو'' ان کی پہلی شعری کاوش تھی جس کے بعد ۲۰۰۱ء میں ان کی تین کتابیں نظموں کا مجموعہ ''سب آنکھیں میری آنکھیں ہیں''،

ماہیوں کا مجموعہ ''پیپل کی چھاؤں میں'' اور نثری نظموں کا مجموعہ انگریزی تراجم کے ساتھ ''میں عورت ہوں'' شائع ہوا۔ رضیہ نے نثر میں بھی طبع آزمائی کی ہے۔ افسانے لکھے، اردو اور انگریزی میں مختصر دورانیے کے سٹیج ڈرامے لکھے۔ کالم نویسی اور رپورتاژ بھی کی۔ مگر طبیعت کی روانی انشاپردازی اور ہلکے پھلکے طنز و مزاح کی طرف مائل رہی۔ چناں چہ ۲۰۰۰ء میں ''چاند میں چڑیلیں'' کے عنوان سے ان کے مضامین کا مجموعہ شائع ہوا۔

نثری نظم کے بارے ان کا کہنا ہے کہ شاعری میں ہر قسم کے تجربے ہونے چاہیے۔ کیوں کہ انسانی طبیعت یکسانیت سے اکتا جاتی ہے۔ نثری نظم کو ابھی تک اُردو ادب میں دل سے تسلیم نہیں کیا گیا۔ اور اسے اپنی جگہ بنانے میں خاصی دشواریوں کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے۔ مگر انگریزی اور مغربی ادب میں یہ تجربہ نیا نہیں ہے بلکہ وہاں یہ ایک پختہ صنف کی حیثیت سے اپنا لوہا منوا چکی ہے۔ بلکہ اس کے بارے میں تو جارج ایلیٹ نے کہا تھا کہ ''شاعری کی معراج نثری نظم ہے''

رضیہ کے نزدیک کبھی غزل، نظم کے مقابلے میں احساسات کی ترجمانی کر دیتی ہے اور کبھی نظم، غزل کو پیچھے چھوڑ جاتی ہے۔ یہ سب لکھنے والے کے مزاج کی بات ہے۔ ویسے ذاتی طور پر رضیہ کی طبیعت غزل کی نسبت نظم سے زیادہ قریب ہے۔ کیوں کہ غزل کی ریزہ خیالی کی نسبت ان کی ذہنی ہیئت تسلسل، تنظیم اور مربوط ہونے کا تقاضا کرتی ہے۔ اس لئے رضیہ نے نظمیں زیادہ لکھی ہیں۔

اُردو شاعری میں وہ پروین شاکر کی شاعری کو نسائی شاعری کا سنگِ میل قرار دیتی ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ میں نے اکثر مرد حضرات سے سنا ہے کہ پروین شاکر کی شاعری نے جینڈر بیریئرز (Gender Barriers) یعنی تذکیر و تانیث کی حد بندی توڑ دی ہے۔ میرے خیال میں یہ بات صحیح نہیں ہے۔ پروین نے حد بندیاں توڑی نہیں ہیں بلکہ انھیں اور مضبوط کیا ہے۔ اس نے صرف اور صرف ایک عورت بن کر عورت کے داخلی جذبات و

احساسات کی ترجمانی کی ہے۔ پروین کی شاعری پڑھتے ہوئے یہ خیال بہت شدت سے دامن گیر رہتا ہے کہ یہ ایک عورت کی شاعری ہے۔ان کے خیال میں پروین کے بعد بھی بہت سی شاعرات نسائی احیائی ادب لکھ رہی ہیں۔مگر جس طرح نثر میں عصمت چغتائی نے عورتوں کو بات کہنے کا حوصلہ دیا ہے، اسی طرح پروین نے نسائی جذبات واحساسات کو بیان کرنے کا قرینہ سکھایا ہے۔رضیہ کے خیال میں وہ لغت جو عورت کے جذبات واحساسات کی ہر رنگ میں ترجمانی کرے، جہاں وہ کبھی عاشق اور کبھی معشوق، کبھی عورت اور کبھی مرد بن کر سوچے، وہ زبان ابھی ہم نے ایجاد نہیں کی۔جب تک ہم نسائی تصور کو سمجھنے کے لئے اس سطح تک نہیں پہنچ پاتے جو عورت کے انرورلڈ (Inner World) یعنی باطنی نفس کو سمجھنے کے لئے ضروری ہے۔ہمیں عورتوں کی تحریروں کو کھلے دل وذہن سے سننا اور سمجھنا چاہیے۔

ان کے پہلے مجموعۂ کلام ''گلابوں کو تم اپنے پاس رکھو'' کا دیباچہ عدیم ہاشمی نے لکھا تھا۔انھوں نے پیش گوئی کرتے ہوئے کہا تھا کہ:

> ''رضیہ ایک اوریجنل (Original) اور جینوئن (Genuine) شاعرہ ہے۔اور وہ یقینی طور پر غیر ملکی حیثیت اور خاتون شاعرہ ہونے کے Barriers اگر کراس نہیں کر چکی تو انھیں کراس کرنے کی مکمل صلاحیت ضرور رکھتی ہے۔بلکہ اس سلسلے میں بیرونِ ملک بسنے والی تمام خواتین کو (سوائے افتخار نسیم کے) رضیہ اسماعیل سے باقاعدہ خائف رہنا چاہیے کہ وہ کسی وقت بھی سب کو پیچھے چھوڑ چھاڑ کے ادب کے کسی بھی قابلِ رشک مقام ومرتبہ پر فائز ہوسکتی ہے۔''

سلطانہ مہر
(کیلی فورنیا)

(ماخوذاز ''سخنور پنجم......۲۰۰۴ء......تذکرہ شعراء وشاعرات......از سلطانہ مہر)

مشرق کی بیٹی

فن کا دیا چاہے کہیں بھی روشن ہو، اس کے راستے میں سرحدیں حائل نہیں ہوتیں۔ ایک ایسا ہی دیا رضیہ اسماعیل کی صورت میں برطانیہ کے شہر برمنگھم میں روشن ہے جس کی لو میں اگر روایتی غزل نظر آتی ہے تو آزاد اور نثری نظموں کی چاشنی بھی محسوس کی جا سکتی ہے۔ اور اس کے ساتھ ساتھ اُردو ماہیے کی روایت کو بھی بہت خوب صورتی کے ساتھ آگے بڑھتے ہوئے دیکھا جا سکتا ہے۔ جب کہ پنجاب میں، جو ماہیے کا روایتی گھر ہے، یہ روایت آہستہ آہستہ ختم ہوتی نظر آتی ہے۔

رضیہ اسماعیل کی تحریروں میں طنز و مزاح کا چسکا بھی محسوس کیا جا سکتا ہے جو ملک سے باہر رہتے ہوئے اپنے تجربات و مشاہدات کی صورت میں انھوں نے ''چاند میں چڑیلیں'' کی صورت میں پیش کیا ہے۔

وطن میں رہتے ہوئے زندگی کو محسوس کرنے اور برتنے کا سلیقہ اور انداز اور ہو سکتا ہے، جب کہ وطن سے دور اجنبی تہذیب میں اپنی روایات اور قدروں کے حوالے سے بات کرنے کا ڈھنگ کچھ اور ہوتا ہے۔ وطن میں گلی، محلے اور ارد گرد کی چیزوں کا احساس کچھ اور ہے جب کہ وطن سے دور رہتے ہوئے اگر یہاں کی خوب صورتیاں یاد آتی ہیں تو منفی رویے بھی یادگار ہوتے ہیں۔ یہاں کے گندے جوہڑ، تنگ و تاریک گلیاں اور غلاظتیں بھی مثبت رویوں کی شکل اختیار کر لیتی ہیں۔

رضیہ اسماعیل کے ماہیے پڑھتے ہوئے واضح طور پر محسوس ہوتا ہے کہ ہمارے ہاں اب تک جتنی بھی پنجابی اور اُردو ماہیوں کی کتابیں شائع ہوئی ہیں، ان سب میں عموماً ایک ہی رو میں، ایک ہی طرح کے ماہیے کہے گئے ہیں۔ مگر رضیہ اسماعیل نے ماہیے کی ایک نئی روایت قائم کرتے ہوئے اپنی کتاب ''پیپل کی چھاؤں میں'' اپنی انفرادیت قائم کی ہے۔ کتاب میں حمدیہ اور نعتیہ ماہیوں کے ساتھ ساتھ پنجاب رنگ، عورت کہانی، شہیدانِ کربلا، ولایتی ماہیوں اور پھر وطن کے حوالے سے نہایت متحرک قسم کے ماہیے انھوں نے الگ الگ حصوں میں پیش کیے ہیں۔ انھیں پڑھ کر شدت سے یہ احساس ہوتا ہے کہ وطن سے دُور رہ کر انھوں نے اپنی مٹی سے ناتا نہیں توڑا۔ اپنی روایات سے بندھے رہنے کو ہی اپنی پہچان بنایا ہے اور ثابت کر دیا ہے کہ ایک طویل عرصہ مغرب میں رہنے کے باوجود وہ مشرق کی ہی بیٹی ہیں۔

ڈاکٹر حسن رضوی

(لاہور)

(یہ مضمون لاہور میں کتابوں کی رسمِ اجرا کی تقریب میں ۲۰۰۱ء میں پڑھا گیا تھا)

ایک نظریاتی شاعرہ

ہمارا المیہ یہ ہے کہ ہمارے بیش تر شاعروں اور خصوصاً غزل کے شاعروں کو شاعری میں نظریہ اور نظریہ سازی کا علم ہی نہیں ہوتا کہ یہ ہے کیا بلا اور ان کے نزدیک صرف قافیہ پیمائی ہی بنیادی وصف ٹھہرتا ہے۔ جن معدودے چند شاعروں کو نظریاتی شاعری کا شوق ہوتا ہے ان کی اکثریت سوڈوازم اور نعرہ بازی کا شکار ہو جاتی ہے۔ ہمارے ہاں خواتین کو سیاسی یا نظریاتی شاعری کا شوق آزادیٔ اظہار اور آزادیٔ جذبات کے نام پر جنسی اور فحش شاعری کی طرف لے گیا۔ یوں ہمیں اُردو ادب میں نظریاتی شاعری کا فقدان ہی نظر آتا ہے۔

رضیہ اسماعیل دنیائے شعر میں یک دم نمودار ہوئی ہیں اور اُردو شاعری کے سنجیدہ قاری کو حیران کر گئی ہیں۔ ان کے یہاں زندگی اور انسانی معاشرتی پیچیدگیوں کا اتنا عمیق اور باریک مشاہدہ نظر آتا ہے اور پھر ایسے شاعرانہ انداز میں نظر آتا ہے کہ قاری ششدر رہ جاتا ہے۔ رضیہ اسماعیل کے موضوعات میں عورت کی محرومیاں اور عورت کے ساتھ ہونے والی تہذیبی ناانصافیاں نمایاں موضوع کے طور پر ملتی ہیں۔ عورت کی بے کسی اور بے بسی کا درد دنیا بھر کی نسوانی تحاریک کی طرح مرد سے نفرت کے اظہار کا باعث بننے کی بجائے زمانے اور فطرت سے انصاف کا طالب ہوتا ہے اور اپنے اندر رشتوں کی تفریق پر نوحہ کناں ہو کر شاعرانہ فرائض کی بجا آوری کا موجب ٹھہرتا ہے۔ رضیہ اسماعیل بجا طور پر نظم بلکہ جدید نظم کی شاعرہ ہیں اور اپنے اسلوب، موضوعات اور ٹریٹمنٹ کے لحاظ سے بہت مختلف اور جدا نظر

آتی ہیں۔ میرا اندازہ ہے کہ ابھی وہ روحانی اور متصوّفانہ موضوعات کی طرف بھی آئیں گی اور پھر ان کی شاعری کی آخری جہت (Final Dimension) کا مرحلہ اس کے بعد ہوگا۔ میں سمجھتا ہوں کہ انھوں نے ہماری شاعری کو بجا طور مالا مال (Enrich) کیا ہے۔

فرحت عباس شاہ
(لاہور)

شاعرۂ خوش گفتار

گلابوں کو تم اپنے پاس رکھو
مجھے کانٹوں پہ چلنا آ گیا ہے

یہ شعر بجائے خود سخن ور کا تعارف ہے۔ اُس کے مزاج، اندازِ فکر، خودداری و خود اعتمادی کو پیش کرتا ہے۔ فکر و فراست کی اساس کو ظاہر کرتا ہے۔ کسی کا دست نگر ہونے کی بجائے حوصلہ مندی کا درس دیتا ہے، اپنے پیروں پر کھڑا ہونے کی تلقین کرتا ہے اور زندگی میں سخت کوشی کی تعلیم دیتا ہے۔ کیوں کہ

سخت کوشی سے ہے تلخ زندگانی، رنگیں

اس شعر کی خالق رضیہ اسماعیل ہیں۔ مصرعہ اولیٰ ''گلابوں کو تم اپنے پاس رکھو'' ان کی غزلوں، نظموں کی کتاب کا عنوان ہے۔ پاکستان کے مختلف شہروں سے تعلیم حاصل کرتی ہوئی برطانیہ پہنچیں اور اب سوشل ورک میں ایم اے اور پی ایچ ڈی کر چکی ہیں۔ پاکستانی خواتین کی متعدد ادبی اور ثقافتی انجمنوں کی رکن اور ''آ گہی'' کی بانی اور صدر ہیں۔

اِس مختصر تعارف کے بعد میں ان کے مذکورہ شعر کی طرف آتا ہوں۔ یہاں گلاب واپس نہیں کیے جا رہے، ورنہ لفظ ''رکھ لو'' آتا۔ بات یہ ہے کہ سرے سے پیش کش ہی قبول نہیں۔ پیہم کوشش اور سخت کوشی نے زندگی کی وادیٔ پُر خار میں چلنا آسان کر دیا ہے۔ یہ شعر بظاہر ایک خوب صورت شعر ہے مگر بڑی فکری ریاضت اور احوال و آثار پر نگاہ و تجزیہ کا نتیجہ

ہے۔ یہ پاکستان کے اربابِ حل وعقد کے لئے بھی راہ نما ہے۔ یہ شعر اتنے تہہ در تہہ معانی رکھتا ہے کہ بات بڑھتے بڑھتے اسی پر ختم ہو سکتی ہے۔ رضیہ اسماعیل نے اُردو کے شعری سرمایہ کو بہت کچھ دیا ہے۔ غزلیں، نظمیں، نثری نظمیں، ماہیے، دوہے اور کیا کیا کچھ۔ مگر میرا موضوع ان کی غزلیں ہیں۔ ''گلابوں کو تم اپنے پاس رکھو'' میں کل پچیس غزلیں شامل ہیں۔ اس کے معنی یہ نہیں کہ رضیہ اسماعیل نے صرف اتنی ہی غزلیں کہی ہوں گی۔ مگر یہ مثال ہے خود احتسابی اور انتخاب کی، ورنہ نوآموز تو دیوان پر دیوان چھپوا رہے ہیں۔

ان کی ہر غزل اپنی جگہ پر انتخاب ہے اور یہاں وہ معتبر شاعروں اور شاعرات کی ہمسر نظر آتی ہیں۔

غزلوں کا بنیادی جوہر تغزل ہے اور مناسب الفاظ کا انتخاب، ان کا در و بست اور خیال افزونی۔ رضیہ کی غزلوں میں یہ بنیادی عناصر بدرجہ اتم موجود ہیں۔ اسی غزل کے دو تین شعر مثالاً درج ہیں۔

یہ کیسی درد کی سوغات دی ہے
بنا شعلوں کے جلنا آ گیا ہے

تجھے یہ سُن کے دُکھ ہو یا خوشی ہو
مجھے گر کر سنبھلنا آ گیا ہے

کیا خودسپردگی کا انداز ہے۔

محبت ہے کہ تو نفرت ہے، جو ہے
ترے سانچے میں ڈھلنا آ گیا ہے

رضیہ صاحبہ کی ساری غزل درد و الم، ہجر و فراق اور دل خون ہونے کی داستاں ہے۔ قدم قدم پر بے وفائی کا تذکرہ ہے مگر ایک اندازِ صبر و سکون ہے۔ کیوں کہ حوصلہ شرطِ عشق

ہے۔لہٰذا ہر جگہ حوصلہ مندی ہے۔مثلاً:

بدلے میں وفاؤں کے تم اور تو کیا دیتے
میری ہی وفاؤں کا تھوڑا سا صلہ دیتے

آئے تھے جو تربت پر ، اتنا تو کیا ہوتا
دو پھول چڑھا دیتے ، اک دیپ جلا دیتے

دل خون ہونے کی کیفیت ملاحظہ ہو اور یہ جگہ جگہ ملتی ہے۔

دل توڑ دیا تم نے ، دل خون کیا ہوتا
اس خون کی رنگت سے تصویر بنا دیتے

گلشن کی کیفیت کو اس طرح پیش کرنا خصوصی توجہ کی دعوت دیتا ہے۔

ہر ایک پھول کلی کو بلا رہا ہے قریب
چمن میں آئے ہیں اب کے کمال کے موسم

زندگی دراصل انسان کی ملکیت نہیں کہ جیسے چاہے اسے برباد کر دے۔ یہ عالمِ انسانیت کی امانت ہے۔کتنی اصلی فکر ہے۔کیسا عظیم فلسفہ ہے اور کتنا عمیق مشاہدہ ہے۔

یہ زندگی کسی کی امانت ہے دوستو
گِن کے بتاؤ جتنے بھی لمحے گنوائے ہیں

چھوٹی بحروں میں رضیہ اسماعیل نے نہایت اعلیٰ درجے کی شاعری کی ہے اور بڑی خوب صورتی سے اپنی شخصیت کے امکانات کو ظاہر کیا ہے۔بعض اشعار تو دل میں اترتے چلے جاتے ہیں جسے ہم نشریت سے تعبیر کرتے ہیں۔ دراصل سادہ الفاظ اور چھوٹی بحر میں پُر اثر شعر کہنا پُل صراط عبور کرنے کے مترادف ہے بشرطیکہ شعر میں سادگی کے ساتھ ساتھ پُرکاری اور اثر انگیزی موجود ہو۔سب سے ہٹ کر تبدیلی لانے کی خواہش کو یوں بیان

کیا ہے:

انوکھا کام کرنا چاہتی ہوں
زمانے کو بدلنا چاہتی ہوں

گھٹائیں جھوم کر اٹھی ہیں مجھ میں
میں بارش ہوں ، برسنا چاہتی ہوں

اندازِ بیاں کی ندرت ملاحظہ ہو۔خیال کو کس خوب صورتی سے پیش کیا گیا ہے۔ پہلے شعر میں تشبیہ بڑی اعلیٰ ہے:

یہ بدلی اس طرح سے چھٹ رہی ہے
کہ جیسے رخ سے چلمن ہٹ رہی ہے

لکھا دیوار پر دیکھا تھا میں نے
زمانے سے محبت گھٹ رہی ہے

کیا شوخ اندازِ بیان ہے مگر ااضافے کے ساتھ حسنِ ذات کی پردہ داری کرتے ہوئے:

صنفِ نازک ہوں اس لئے شاید
سب نے ہی مجھ سے آشنائی کی

اور پھر:

ہر پل کو دیکھ کے ڈرتی ہوں
ہر وقت سے دھوکا کھایا ہے

رضیہ اسماعیل نے کچھ مکالماتی غزلیں بھی لکھی ہیں۔اس کی روایت گفتم ، گفتا کے ساتھ فارسی شاعری میں قدیم ہے۔علامہ اقبال کی فارسی شاعری میں اس کے نمونے زیادہ

ملتے ہیں مگر اُردو شاعری میں خال خال ہیں۔ عدیم ہاشمی نے اس روایت کو تازہ کیا اور رضیہ اسماعیل نے اس کے تتبع میں چند مکالماتی غزلیں اور نظمیں بھی کہی ہیں۔ اشعار ملاحظہ ہوں۔

کہا، عورت کو کیوں سمجھا نہیں ہے آج تک کوئی
جواب آیا، کہاں سمجھیں گے عورت تو پہیلی ہے

کہو، غمگین چہرے پر تمھیں کیسی لگی آنکھیں
کہا، ویراں سرائے میں دیئے جلتے ہوئے دیکھے

کہو، انسان کے غم میں کبھی غمگیں ہوئے تم بھی
کہا، آنسو فلک کی آنکھ سے گرتے ہوئے دیکھے

وقت کی قلت کے پیشِ نظر یہ ایک انتہائی تشنہ جائزہ ہے۔ رضیہ اسماعیل کی شاعری نقد ونظر کے لئے ایک پُر مغز مقالہ درکار ہے۔

عثمان صدیقی
(لاہور)

(۲۰۰۱ء میں لاہور میں کتابوں کی رسمِ اجرا کی تقریب میں پڑھا گیا)

ایک نئی شعری تہذیب

اُردو شاعری میں شاعرات کو فنی و معنوی حوالے سے دو گروہوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ ایک گروہ ایسا ہے جنھوں نے محض روایتِ شعر کی پیروی میں شاعری کی اور ان شاعرات کی فنی و معنوی حوالے سے اپنی کوئی شناخت نہ بن سکی۔ دوسرے قبیلے میں پروین شاکر، فہمیدہ ریاض اور چند اور شاعرات کے نام اہم ہیں۔ انھوں نے اپنی خالص نسوانی ذات اور فطری واردات کو شاعری کا منبع بنایا اور خصوصاً پروین شاکر نے اُردو شاعری کو ایک خوب صورت اور منفرد رنگ دیا۔ پروین کے ہاں عورت اپنے خالص، فطری اور تخلیقی وجود کی تمام تر رعنائیوں کے ساتھ شعری پیکر میں ڈھلتی ہے۔ اس کے ہاں فیمنسٹ تحریک کے زیرِ اثر کسی قسم کی مزاحمتی شاعری مشکل ہی سے نظر آئے گی۔ اس کے برعکس فہمیدہ ریاض اور کشور ناہید جیسی شاعرات کے ہاں نسوانی تحریک اپنے برہنہ اور غیر فطری خد و خال کے ساتھ موضوعِ شعر بنتی ہے۔ پروین شاکر کی شاعری کا یہ مسئلہ رہا کہ وہ ایک مخصوص (Elite) کلاس کی عورت کی جذباتی کیفیات و نفسیات سے باہر نہ نکل سکی۔ چناں چہ اس کی عورت معنوی سطح پر ایک عالم گیر تصور نہیں بنتی۔ اسی طرح فہمیدہ ریاض کے قبیلے کا مسئلہ یہ رہا کہ انھوں نے خلوصِ شعر و تخلیق کو بہت پیچھے کہیں گم کرنے کے بعد سطحی اور غیر فطری نعرہ بازی کی پیروی اختیار کر لی۔ چناں چہ اُردو شاعری میں خواتین کی شاعری تا حال کسی فلسفیانہ نظام یا کم از کم عورت کے کسی عالم گیر صورت تک نہیں پہنچ سکی۔

اس صورتِ حال میں دیارِ غیر میں بیٹھ کر اور بہت سی ادبی گروہ بندیوں اور سرگرمیوں سے دور رہ کر رضیہ اسماعیل جو شاعری کر رہی ہیں وہ انتہائی حیران کر دینے والی ہے۔ شاعری نے اس کی روح کو اپنے اندر بسا لیا ہے اور یوں اس پر ہر لمحہ وجدان و آگہی کے لاتعداد در وا ہوتے رہتے ہیں۔ اس کی ذات میں موجزن روحِ شعر نے اسے تمام روایتی سہاروں سے بے نیاز کر دیا ہے۔ چناں چہ وہ خالصتاً اپنی تخلیقی قوت پر انحصار کرتے ہوئے زمینِ ادب پر اپنی بستی اور تہذیب بسا رہی ہے۔

رضیہ اسماعیل کے ہاں عورت کا ایک کائناتی وجود سامنے آتا ہے جو آگہی اور درد کے مماثل ہے، جو ہستی کے مماثل ہے۔ عورت کا یہ عالم گیر تصور اسے تمام خواتین شعرا میں ممتاز اور منفرد بنا دیتا ہے۔ اس کی زبان، اسلوب اور موضوعات اس کی تخلیقی ذات اور واردات سے پھوٹتے ہیں۔ گویا اس کا ذاتی شعور اتنا پختہ ہے، ہمہ جہت اور مکمل ہے کہ اسے کسی خارجی نعرے کے سہارے کی ضرورت پیش نہیں آئی۔ اس کی تمام شاعری میں جذبے، احساس اور معنویت کی غیر ممیّز فراوانی ہے۔ اس کی شاعری میں ایک مکمل فکری (Thesis) موجود ہے لیکن یہ فکر، یہ فلسفہ چوں کہ رضیہ اسماعیل کی تخلیقی ذات اور واردات سے پھوٹتا ہے اس لئے کہیں بھی کو ملتا اور احساس سے عاری نہیں ہوتا۔

اس کے ہاں عورت کے ہر روپ کی واردات اور شدتِ احساس زندہ ہے۔ اس کی فکر سے جذبہ پھوٹتا ہے اور جذبے سے فکر و فلسفہ۔

اگرچہ رضیہ اسماعیل کے ہاں ہیئت (Structure) ابھی اپنی پختگی کو مکمل طور پر نہیں پہنچی لیکن یہی امر شاید اس کے اندر نئی ہیئتوں کی تخلیق کا باعث بن جائے۔ اس کے ہاں بعض بنیادی فلسفیانہ موضوعات اور سوالات اور پھر ان کے فکری جوابات ایک ساتھ ذاتی واردات کی شکل میں سامنے آتے ہیں۔ اس کے حیات و موت، جبر و قدر، انسان اور زندگی کے بارے میں بالکل نیا، جدا اور موثر بلکہ زندہ فکری آہنگ ظہور پذیر ہوتا ہے۔ اس کے

شعری مضامین میں یہ تمام معنوی صورتیں بالکل فطری، غیر محسوس اور خارجی مطالعے کے اثرات سے پاک محض باطنی واردات کے طور پر شامل ہیں۔ رضیہ اسماعیل کے شعریت اور فکر و معنویت دونوں انتہائی طاقت ور ہیں اور اس کی شاعری کی صورت میں اُردو ادب ایک نئی شعری تہذیب سے آشنا ہو رہا ہے۔

ڈاکٹر علی اکبر منصور
شعبۂ اطلاقی نفسیات
پنجاب یونیورسٹی لاہور

برطانیہ میں اُردو کی اَن تھکی مزدور خاتون

اکثر مائیں اپنے بچوں کو ننھیال سے جڑے قصے سناتی ہیں۔ میں نے بھی اپنے بچپن میں اپنی ماں سے ان کے ایک دُور افتادہ بھائی کا قصہ سنا تھا۔ جو اَب پورا تو یاد نہیں لیکن کچھ اس طرح تھا کہ میرے ایک ماموں ''چندا'' تھے۔ ان کی کوئی پریمیکا تھی۔ لیکن قابیل نامی کسی زمین زاد نے اس پریمیکا کو مار ڈالا۔ جس سے ماموں کا دل ٹوٹ گیا۔ انہوں نے شادی نہیں کی اور وہ گھر چھوڑ اپنی پرانی ملازمہ کو ساتھ لے کر دور آسمان پر جا بسے۔ اب وہ ملازمہ بوڑھیا ہوگئی ہے اور چندا ماموں کے گھر میں بیٹھی چرخے پر سوت کاتتی ہے۔ ادھر چندا ماموں ہم زمین زادوں سے بدلہ لینے کے لئے خود تو تھالی میں کھاتے ہیں اور ہمیں صرف ٹھینگا دکھا کر تھوڑا سا دودھ پیالی میں دیتے ہیں۔ جب ان کو بھانجوں بھانجیوں پر بہت غصہ آتا ہے تو سکڑ کر انگلی کے ناخن کی طرح منحنی ہو جاتے ہیں اور جب یہ غصہ کم ہوتا ہے تو ''پورن ماشی'' بن کر ہم سب پر اپنی محبت نچھاور کرتے ہیں۔

قصے کہانیاں تو تخیل کی پرواز ہیں۔ اور جیسے جیسے انسان اپنے سن بلوغ کی طرف بڑھتا ہے اس کا تخیل بھی پھلتا پھولتا ہے۔ سنا ہے جب سے آج کی ترقی یافتہ اقوام کے دہشت پسند گھس بیٹھیوں نے چندا ماما کے گھر پہنچ کر غریب بڑھیا کو مار ڈالا ہے اس کی روح چڑیل بنی چندا ماموں کے گھر میں بھٹک رہی ہے۔

معاف کیجئے کہنا کچھ اور تھا اور بات چل پڑی قصہ کہانی کی۔ ہاں تو بات یہ تھی کہ ایک

دو ہفتے قبل ٹیلی فون پر ایک فرمائش موصول ہوئی۔ ایک نقرئی نسوانی آواز میں فرمائش تھی کہ ان کے ادبی گوشے کے لئے میں چند سطور رقم کروں۔ اس قسم کی فرمائشوں کو پورا کرنے میں دقت یہ پیش آتی ہے کی اگر سچ بات لکھ دی جائے تو ممدوح سے تعلقات خراب ہی نہیں بلکہ بالکل بریدہ ہو جاتے ہیں۔ لیکن اس بار سچ کہنے پر ایسا کوئی ڈر نہیں۔

چند سال ہوئے میرے ایک بزرگ جناب محمود ہاشمی نے رضیہ اسمٰعیل کو مجھ سے ٹیلی فون پر متعارف کرایا تھا۔ اس وقت اس خاتون نے برطانیہ میں اردو کی خواتین قلمکاروں کی ایک ڈائرکٹری مرتب کی تھی۔ اس ڈائرکٹری کے لئے موصوفہ نے محمود ہاشمی صاحب سے ایک مضمون لکھنے کی فرمائش کی تھی۔ لیکن محمود ہاشمی صاحب نے مضمون لکھنے کا قرعہ میرے نام نکالا۔ جس کی میں نے تکمیل کی۔ جب یہ ڈائرکٹری مکمل ہوگئی تو موصوفہ نے اس کی تقریبِ اجرا (آج کی زبان میں تقریبِ رونمائی) میں بلا کر مجھے عزت بخشی تھی۔ اور اس طرح ان سے بالمشافہ ملاقات کا شرف حاصل ہوا تھا۔ دوسری بار برمنگھم کے ایک دورے میں محترمہ طلعت سلیم صاحبہ اور محترمہ سلطانہ مہر صاحبہ کے توسط سے ان سے ملاقات ہوئی۔ تب پتا چلا کہ یہ طبعی شاعر ہیں۔ اچھا کلام کہتی ہیں۔ اردو ادب سے گہرا شغف رکھتی ہیں۔ ویسے تو برطانیہ میں اردو کے شاعر بہت ہیں اور ان کی وجہ سے برطانیہ میں مشاعروں کا بازار بھی گرم ہے اور بقول ان کے اس وجہ سے برصغیر ہند سے باہر اردو کی ایک بڑی ''درگاہ'' جزائر برطانیہ میں بھی ہے۔ اس کے علاوہ اردو ادب کے مجاوروں کی تعداد بھی کچھ کم نہیں جو ''ساڈھے کلچر'' کے چھکڑے پر سوار مقامی کونسلوں کے تعاون سے متشاعروں کو شاعر بنا کر اس تکیہ کی رونق میں اضافہ کر رہے ہیں۔ پر رضیہ ان سے مختلف ہیں۔ شاید پہلی بار کسی نے، خواہ وہ صرف خواتین قلم کاروں کی ہی ہو، اردو کے قلم کاروں کی ایک ڈائرکٹری مرتب کی اور جزائر برطانیہ کے طول و عرض میں رہنے والی خواتین و مرد قلم کاروں کے لئے ایک دوسرے سے رابطے کی صورت مہیا کی۔

پھر چند مہینے ہوئے برمنگھم سے کتابوں کا ایک پارسل بذریعہ ڈاک موصول ہوا۔ کھولا تو دیکھا کہ اس میں رضیہ اسمٰعیل کی کئی تصانیف ہیں۔ اور میرے علم میں یہ اضافہ ہوا کہ اس خاتون کا شاعری کے علاوہ نثر لکھنے کے شریفانہ پہلو سے بھی تعلق ہے۔ وقت کی کمی (ویسے یہ عذر لنگ ہے) کی وجہ سے میں ان کی تمام تصانیف کا مطالعہ نہیں کر سکا لیکن ان کی تین کتابیں ''چاند میں چڑیلیں'' (نثر) ''میں عورت ہوں'' اور ''گلابوں کو تم اپنے پاس رکھو'' (مؤخرالذکر دونوں شعری مجموعے اور ان میں اول الذکر میں ان کی نثری نظموں کا انگریزی ترجمہ بھی شامل ہے) نظر سے گزر چکی ہیں۔ ان کی شاعری میں زندگی کی حرارت ہے۔ ان کی نثر میں طنز کا پہلو نمایاں ہے، ایسا طنز جو زندگی کی حقیقتوں پر سے اس طرح پردہ اُٹھاتا ہے کہ قاری طمانچہ محسوس تو کرتا ہے لیکن بلبلاتا نہیں یہ دوسری بات ہے کہ مزاح کی وجہ سے اس کا چہرہ تمتما جائے۔ محمود ہاشمی صاحب نے بالکل سچ کہا ہے .... ''شاعروں اور مشاعروں کی بالادستی کے دور میں ایک شاعر کا نثر اور وہ بھی طنز و مزاح کی طرف متوجہ ہونا ایک خوش آئند بات ہے''۔ محمود ہاشمی کی طرح اس راقم الحروف کو بھی امید ہے کہ رضیہ اسمٰعیل نثر نگاری کی طرف مزید توجہ دیں گی اور اس شریفانہ صنف ادب میں گراں قدر اضافہ کریں گی۔ تاہم طنز پر مزاح کی کھٹی میٹھی تہہ جمانے سے پہلے محترمہ رضیہ اسمٰعیل کو اس بات کا خیال رکھنا ہوگا کہ مزاح کی تہوں کے نیچے طنز کا تیز دھارا بالکل کھٹّل نہ ہو جائے۔ کیوں کہ جب کسی قوم میں اقلیت کے افراد ایک طویل مدت تک غلامی یا کثیر التعداد فرقے کے جور و ظلم سے گزرتے ہیں تو ان کی نفسیاتی کیفیت کچھ ایسی ہو جاتی ہے کہ ان پر کیئے گئے کسی قسم کے استحصال کو استحصال نہیں سمجھتے اور وہ ہر ذلت کو برداشت کر جاتے ہیں۔ ان کے ضمیر کو جگانے اور ان میں فعل کی قوت کو متحرک کرنے کے لئے سیدھے سبھاؤ سے کہی بات موثر نہیں ہوتی تا آنکہ کہی بات سے ان کے منہ پر ایسا کھلا تھپڑ نہ پڑے جس سے وہ تلملا کو متحرک ہو جائیں۔ لیکن بہت زیادہ مزاح کی موجودگی اکثر اوقات قاری میں ہنسوڑ کی کیفیت پیدا

کر کے طنز میں ڈوبا پہلو بالکل بے اثر کر دیتا ہے۔

محترمہ رضیہ اسمٰعیل اس لحاظ سے قابل مبارک باد ہیں کہ انہیں ابلاغ کے سلسلے میں عصری تقاضوں کا علم ہے چنانچہ جہاں تک مجھے علم ہے برطانیہ میں یہ پہلی اردو ادیبہ ہیں جنہوں نے اردو ادب کے سلسلے میں ایک ویب سائٹ ''آ گہی'' کا اجرا کیا ہے۔

میری دعا ہے کہ محترمہ رضیہ اسمٰعیل اسی طرح برطانیہ کے اردو ادب کی ترقی میں معاون رہیں۔

ڈاکٹر صفات علوی

بریڈفورڈ، یو۔کے

ہمہ جہت شاعرہ

محترمہ رضیہ اسماعیل کی شاعرانہ حیثیت کسی تعارف کی محتاج نہیں۔ ہر چند کہ ان کا مستقر برمنگھم ہے مگر پاکستان سے ان کا رابطہ بدستور ہے۔ ہر سال وہ لاہور آتی ہیں۔ مشاعروں میں شریک ہوتی ہیں، ادبی تقریبات میں بلائی جاتی ہیں۔ یہ بڑی بات ہے کہ اپنی کتابوں کی افتتاحی تقریبات کے لئے بھی انھوں نے لاہور کا انتخاب کیا، اگرچہ برمنگھم میں وہ متعدد ادبی تنظیموں کی روحِ رواں اور ''آگہی'' کی بانی اور صدر ہیں۔ اب تک ان کی پانچ کتابیں منظرِ عام پر آ چکی ہیں۔ ''گلابوں کو تم اپنے پاس رکھو''، ''میں ایک عورت ہوں''، ''چاند میں چڑیلیں''، ''سب آنکھیں میری آنکھیں ہیں'' اور ''پیپل کی چھاؤں میں''

ایک مختصر جائزے میں ان کی تخلیقات کا احاطہ کرنا اور ان کی ادبی و شعری خصوصیات پر خاطر خواہ نظر ڈالنا کارِدارد ہے۔ دراصل اس کے لئے ایک مربوط مقالہ یا کتابچہ درکار ہے، جب کہ وقت کی محدودیت کا تقاضا کچھ اور ہے۔

ان کا مجموعہ ''میں عورت ہوں'' نثری نظموں کی شکل میں ہے جس میں کم وبیش پچیس نظمیں ہیں اور ان کا انگریزی ترجمہ علی الترتیب ساتھ ساتھ ہے۔ دائیں طرف اُردو نظمیں ہیں اور بائیں طرف انگریزی ترجمے۔ تمام نظموں میں کسی نہ کسی انداز سے عورت کی بے چارگی اور مظلومیت کو پیش کیا گیا ہے جو دردِ دل رکھنے والے قاری کو شدت سے متاثر کرتا ہے۔ پیش لفظ میں محترمہ رضیہ اسماعیل بجا طور پر رقم طراز ہیں:

''اکیسویں صدی میں داخل ہونے کے باوجود عورت کے دکھ ابھی تک عورت کے دکھ

درد ہیں۔صنفِ مخالف کے لئے ان دکھوں کا ادراک کرنا تو دور کی بات ہے، ابھی تک وہ اسی یقین اور بے یقینی کی سولی پر لٹک رہے ہیں کہ عورت کے حقیقت میں کوئی دُکھ ہیں بھی یا سب ڈھونگ ہے؟''

یہی تمام نثری نظموں کا لب لباب ہے۔مثلاً چند لائنیں نظم ''نئی زمین'' سے

نئی زمین

نکاح کے دو بول......
مرد اور عورت کے جسمانی ملاپ کا لائسنس!
نئے رشتوں کی زنجیر میں جکڑی عورت
فرائض کی گٹھڑی سر پر لادے
نئی زمین، نیا پودا
کسی نے سوچا......
اس پودے کے لئے نئی زمین کی آب وہوا
کتنی موافق ہے......!

یہ تو ہوئی نثری نظموں کے مواد کی بات۔موضوعات کی پیش کش، فنی اعتبار سے ہر چند کہ نثری نظم ابھی بحث وتمحیص کی حد سے نہیں نکلی، رضیہ ہر نظم کے حوالے سے کامیاب شاعرہ نظر آتی ہیں۔

فکری سطح پر ان کی فکر سطحیت سے بالاتر ہے اور ان کا مشاہدہ وسیع اور برائے شعر گفتن کی روایت سے وہ بہت بلند ہیں۔

''چاند میں چڑیلیں'' ان کا نثری کارنامہ ہے۔مضامین طنز ومزاح لیے ہوئے ہیں۔ ان مضامین کا محرک بچپن میں ان کی نانی گرانڈیل مدر کے ہمہ جہت دل چسپ آمرانہ قسم کے نقوش ہیں۔انتظار حسین نے بھی افسانہ نگاری نانی اماں سے سیکھی اور رضیہ صاحبہ کی افسانہ نگاری کے سوتے آخر نانی اماں ہی سے ملتے ہیں۔مضامین پر تبصرے کے لئے تو دفتر

درکار ہے۔تمام مضامین مزاح کی پُرکاری لیے ہوئے ہیں۔مجموعے میں گوسترہ مضامین ہیں مگر جب تک تمام پڑھ نہ لیے جائیں، کتاب ہاتھ سے رکھنے کو جی نہیں چاہتا۔طنز ومزاح نگاری میں رضیہ خاص مزاج رکھتی ہیں اور کامیاب بھی ہیں۔طنز ومزاح پر کوئی بھی جائزہ، مضمون، مقالہ ان کو شامل کیے بغیر آگے نہیں بڑھ سکتا۔''گرینڈ مدر''، ''ہائے یہ گوریاں''، ''محبت کی کارفرمائیاں''، ''رنگ برنگ ناریاں'' اعلیٰ درجے کی مزاح نگاری اپنے اندر سموئے ہوئے ہیں۔اگر رضیہ اسماعیل اسی نثری کاوش پر ہی اکتفا کرلیتیں تو بھی ان کا ادبی مقامِ قابلِ رشک رہتا۔

تیسری کتاب ''سب آنکھیں میری آنکھیں ہیں'' ایک بلیغ استعارے کی نظموں کا مجموعہ ہے۔اکثر آزاد نظمیں ہیں، کئی نثری نظمیں بھی ہیں۔انتساب بنیادی خصوصیت کی طرف رہنمائی کرتا ہے۔''......ان آنکھوں کے نام......جو بصارت کے ساتھ ساتھ بصیرت بھی رکھتی ہیں۔'' خود محترمہ رضیہ لکھتی ہیں۔

''میری آنکھوں نے کیا دیکھا، کیا سمجھا، کیا کھویا، کیا پایا، کسے اپنایا، کسے ٹھکرایا، کہاں بھٹکیں، کہاں ان کی سرزنش ہوئی، کس منظر کو یاد رکھا، کسے بھلا دیا، کس سے بات کی، کس سے منہ موڑا، کہاں اٹھیں، کہاں جھک گئیں، کہاں دل بن گئیں، کہاں ذہن میں ڈھل گئیں، کہاں ان پر پیار آیا، کہاں انھیں نوچ کر پھینکنے کو جی چاہا، ایک نہ ختم ہونے والا منظر نامہ ہے جو قلم کے راستے کاغذ کی روح میں اتر گیا ہے۔''

ادب سرائے کی مؤسس محترمہ شہناز مزمل نے اپنے تبصرے ......''چشمِ نم، چشمِ حیراں'' میں درست لکھا ہے کہ رضیہ اسماعیل نے ''سب آنکھیں میری آنکھیں ہیں'' میں مشاہدے کی آنکھ سے حاصل شدہ تمام تر موضوعات کو گرفت میں لاکر اکٹھا کرنے کی کوشش کی ہے۔'' اور پھر رضیہ کا بزبانِ شعر اظہار:

کہو، غمگین چہرے پر تمھیں کیسی لگی آنکھیں
کہا، ویراں سرائے میں دیئے جلتے ہوئے دیکھے

ایک تعارفی تقریب میں کوئی طویل بات نہیں کہی جاسکتی۔ مختصر یہ ہے کہ سب مٹی میں مل جاتے ہیں، اجڑے شجر، دریدہ بادباں، ہمزاد، کشکول، سب آنکھیں میری آنکھیں ہیں، سورج کی موت، زباں خاموش رہتی ہے...... پُر تاثیر اور فکر انگیز نظمیں ہیں۔

''گلابوں کو تم اپنے پاس رکھو'' ان کی آزاد نظموں اور غزلوں کا مجموعہ ہے۔ اور یہی ان کا حقیقی شاعرانہ تعارف ہے۔ ان کی غزلیں خبر سے نہیں، نظر سے عبارت ہوتی ہیں جو جدید غزل کے اچھے پہلوؤں کی نمائندگی کرتی ہیں۔ وہ اُردو غزل کی روایات واسالیب سے اچھی طرح واقف ہیں۔ اس مجموعے میں ان کی یہ واقفیت خوب نظر آتی ہے۔ غزلیں پڑھنے میں بہت پُر لطف معلوم ہوتی ہیں۔ الفاظ وتراکیب کی خوب صورتی اور بیان کی تازگی جا بجا ملتی ہے۔ اس کا اندازہ ان اشعار سے بخوبی لگایا جاسکتا ہے۔

پھر بھول گئے ہم آندھی کو
پھر آس کا دیپ جلایا ہے

نہیں حاصل پشیمانی سے کچھ بھی
جو کھیتی بوئی تھی، وہ کٹ رہی ہے

اپنوں نے وہ درد دیا ہے
لوگ بگانے یاد آتے ہیں

تو اپنی آنکھ میں تابِ بہار لا تو سہی
جہان بھر میں ہیں حسن و جمال کے موسم

قتل جس نے کیا ہے خوشبو کو
اب اسے سنگسار کرنا ہے

اس شعری مجموعہ میں ان کی نظموں کی تعداد کہیں زیادہ ہے جس میں نثری اور آزاد، دونوں نظمیں ہیں۔ اپنی اپنی جگہ پر ہر نظم اعلیٰ ہے اور فکری نہج دیتی ہے جو بہت امید افزا نظر آتی ہے:

دھنک رنگ

مجھے مٹانا ہو تو

پہلے میرے ہاتھوں کی لکیروں کو مٹاؤ

میں جانتی ہوں تم ایسا نہیں کر سکتے

کیوں کہ......

ان لکیروں کی طرح میں بھی اَن مِٹ ہوں

روح کا پرندہ جب جسم کا پنجرہ توڑ کر

آزاد ہو جائے تو جسم مٹتا ہے

مگر میں نئی زمینوں پر

ہمیشہ زندہ رہوں گی

کہکشاں بن کر

کسی اور آسمان کا چاند......

کسی دل میں حسین یاد......

کسی آنکھ کا آنسو......

کسی لب کی فریاد......

کسی فریم کی تصویر......

کسی پاؤں کی زنجیر......

کسی قبر کی جاگیر بن کر......

کیوں کہ......

میں دھنک رنگوں سے بنی

''عورت ہوں''

رضیہ کا کلام تجربے کی تازگی، مضمون کی معنویت اور اسلوب کے انوکھے پن کی بنا پر بے حد متاثر کرتا ہے۔

''پیپل کی چھاؤں'' حمدیہ، نعتیہ، منقبت، سیاسی، عوامی، طنزیہ، روایتی اور ولایتی ہر طرح کے سینکڑوں ماہیوں کا مجموعہ ہے جو ایک سے بڑھ کر ایک ہیں۔ ایک ایک ماہیا ہر رنگ کا ملاحظہ ہو۔

تو باغ کا مالی ہے
تیری رحمت کا
جگ سارا سوالی ہے
(حمدیہ)

فرمان وہ لے آیا
سینے میں رکھ کر
قرآن وہُ لے آیا
(نعتیہ)

رحمت کی گھٹائیں ہیں
شہرِ مدینہ کی
پاکیزہ فضائیں ہیں
(نعتیہ)

سب اپنے پرائے تھے
کوفے والوں نے
کیا زخم لگائے تھے
(شہیدانِ کربلا)

قسمت کا دھنی غازی
ہار کے جاں اپنی
وہ جیت گیا بازی
(غازی علم الدین)

اک لڑکی گاؤں میں
ماہیے لکھتی ہے
پیپل کی چھاؤں میں
(پنجاب رنگ)

بڑا ظلم کماتے ہو
عورت ماں بھی ہے
کیوں اُس کو رُلاتے ہو
(عورت کی کہانی)

شبنم کا قطرہ ہے
تنہا عورت کو
ہر طرف سے خطرہ ہے
(عورت کی کہانی)

کاٹیں گے جو بوئیں گے
وقت گنوایا تو
تا عمر ہی روئیں گے
(روایتی)

کہیں پھول برستے ہیں
بچے غریبوں کے
روٹی کو ترستے ہیں
(وطنِ عزیز کی یاد میں)

پالیٹکس میں آئیں گے
خالی جیبیں ہیں
بڑا مال بنائیں گے
(وطنِ عزیز کی یاد میں)

یوکے میں بستے ہیں
کیسا مقدر ہے
روتے ہیں ، نہ ہنستے ہیں
(ولایتی)

انگلینڈ کے کیا کہنے
میموں نے گرمی میں
کپڑے ہی نہیں پہنے
(ولایتی)

کشمیر کی وادی ہے
جائے کوئی روکے
یہ جبری شادی ہے
(ولایتی)

سخن تمام، مگر رہ گیا بہت باقی

شاہد بخاری
(لاہور)

(لاہور میں کتابوں کی رسمِ اجرا کی تقریب کے لئے لکھا گیا)

شگفتہ بیان ادیبہ

شاعروں اور مشاعروں کی بالا دستی کے دور میں ایک شاعر کا نثر اور وہ بھی طنز و مزاح کی طرف متوجہ ہونا ایک خوش آئند بات ہے۔

رضیہ اسماعیل مبارک باد کی مستحق ہیں کہ انہوں نے نہ صرف نہایت سنجیدگی سے معیاری شاعری کی ہے بلکہ نثر لکھ کر ثابت کر دیا ہے کہ اگر لکھنے کا ڈھنگ آتا ہو، مزاج میں اُپج ہو، طبیعت میں روانی ہو تو نثر میں برجستگی اور شگفتگی سے ایسی ایسی جادو بیانی کی جا سکتی ہے کہ اس پر کئی شعر قربان کیے جا سکتے ہیں۔

رضیہ اسماعیل نے نثر لکھ کر اِس فصیل کو بہت حد تک توڑ دیا ہے جو آج کے اکثر ادیبوں کے لاشعور میں نثر کی طرف جانے والے راستے میں ایک کوہِ گراں بن کر کھڑی رہتی ہے۔

محمود ہاشمی

برمنگھم، برطانیہ

انوکھا کام کرنا چاہتی ہوں

اس مصرعے کی خالق رضیہ اسماعیل ایک باذوق اور باصلاحیت خاتون ہیں ۔ وہ شاعری بھی کرتی ہیں ، نثر نگاری کا بھی شوق ہے۔ ان کی طنز و مزاح کے مضامین کا مجموعہ ''چاند میں چڑیلیں'' جون ۲۰۰۰ء میں شائع ہوا تھا۔ اس مجموعہ میں ان کے بہت دلچسپ مضامین ہیں۔ شگفتہ عنوان ہی سے آپ کو مضمون کا اندازہ ہو جائے گا۔ مثلاً گرینڈ مدر، چھوٹی کی کرشمہ سازیاں ، ہائے یہ گوریاں ، ادبی جمود وغیرہ۔ گرینڈ مدر میں نانی کا تذکرہ کرتے ہوئے وہ لکھتی ہیں:

''اپنی اس قدر صحت مند نانی دیکھ کر ہمیں دوسروں کی مریل قسم کی نانیاں بہت اچھی لگتیں۔ بچپن کی بہت سے خواہشات میں سے ہماری ایک خواہش یہ بھی رہی کہ اللہ میاں ہمیں بھی ایک لرزتی کانپتی ہوئی نانی عطا کرتے۔''

دوسرے مضمون میں جس کا عنوان ''آگئی'' ہے، لکھتی ہیں:

''آگئی دراصل اُردو زبان کے خوب صورت لفظ ''آگہی'' کی بگڑی ہوئی شکل ہے۔ دنیا میں جہاں جہاں بھی اُردو زبان بولی اور سمجھی جاتی ہے، وہاں اسے ''آگہی'' کہتے ہیں مگر برطانیہ میں لوگ اسے ''آگئی'' کہتے ہیں۔ دراصل بگاڑ ہمارے کلچر کا اتنا اہم جزو بن چکا ہے کہ زندگی کا کوئی شعبہ اب خالی نظر نہیں آتا۔ ایسے میں اگر ''آگہی'' کو بگاڑ کر ''آگئی'' بنا دیا گیا ہے تو کچھ زیادہ حیرت نہیں ہونی چاہیے۔

رضیہ اسماعیل کے یہ مضامین بظاہر تو طنز و مزاح سے بھرپور ہیں مگر ان کو پڑھ کر جہاں ہنسی آتی ہے وہاں انسان کو کچھ کھو جانے کا احساس بھی ہوتا ہے اور علامہ اقبال کا یہ شعر سماعت سے ٹکرانے لگتا ہے۔

وائے ناکامی متاعِ کارواں جاتا رہا
کارواں کے دل سے احساسِ زیاں جاتا رہا

ان کے دل چسپ جملے اور طنز کے تیرونشتر ہماری اپنی کمزوریوں اور بصیرت و بصارت دونوں کے فقدان کا شدید احساس دلاتے ہیں۔''ادبی جمود'' کے عنوان والے مضمون میں اس کا سب سے زیادہ احساس ہوتا ہے۔اپنی ذات اور انا کے حصار میں مقید لوگ کس طرح ایک دوسرے کو نیچا دکھانا اپنی زندگی کا نصب العین سمجھ لیتے ہیں۔''سنا ہے ہمارے دانش ور جب کبھی رسمی یا غیر رسمی طور پر مل بیٹھتے ہیں تو اُردو ادب پر طاری جمود کے بارے میں بہت پریشان بلکہ پروفیسر پریشان بن جاتے ہیں۔ہمارے خیال میں پروفیسر صاحب بھی زندگی میں اپنے منفرد نام سے اتنے پریشان نہ ہوئے ہوں گے بلکہ جس نے نام ہی پری شان رکھ لیا تو پریشانی کو ان سے کیا سروکار؟ ایسے میں پریشانی در بدر کی ٹھوکریں کھاتی ہوئی دانشوروں، شاعروں اور ادیبوں کے آنگن میں خیمے گاڑ دیتی ہے۔''

اور مذاق ہی مذاق میں وہ پتے کی بات کہہ جاتی ہیں، ایسی حقیقت جس کا آپ سنجیدگی سے اظہار نہیں کر سکتے۔اسی ادبی جمود میں......

''اُردو ادب پر جاری جمود کو توڑنے کے لئے برطانیہ کے ایشیائی ریڈیو اسٹیشن بہت فعال کردار ادا کر رہے ہیں۔شعر و شاعری کے پروگراموں میں لوگ اساتذہ تک کے کلام کو اپنا کلام کہہ کر سنا جاتے ہیں۔پروگرام کرنے والوں کو پتا تک نہیں چلتا کہ کس کا کلام تھا بلکہ وہ شاید اچھے بھلے شاعر کے نام سے واقف تک نہیں ہوتے تو کلام کا کیا خاک پتا چلے گا۔ ایسے میں ہم ایسے کورذوق پری شان ہوئے بغیر نہیں رہ سکتے۔اس فاش چوری کی اگر نشان

دہی کی جائے تو بڑی معصومیت سے جواب دیتے ہیں کہ اچھا میرے خیال میں یہ شعر میرا ہے۔اس سادگی پہ کون نہ مرجائے اے خدا!''

رضیہ اسماعیل نے مزاح میں در پردہ بڑی بڑی حقیقتوں سے پردہ اٹھایا ہے۔ان کی تمام تحریریں بظاہر مزاحیہ ہیں لیکن بین السطور آپ کو اپنے معاشرے کے ان رویوں کا بیان ملتا ہے جو ایک تہذیب یافتہ معاشرے میں معیوب سمجھے جاتے ہیں۔ایک ادیب خواہ وہ ایک سنجیدہ مضمون کے ذریعے ہو یا طنز ومزاح سے کمیونٹی کی اصلاح کی کوشش کرتا ہے۔اگر اس طرح اصلاح ممکن نہ ہو تو بھی وہ ایک باشعور انسان کی طرح زندگی کے غلط رویوں کی طرف اشارہ تو کرسکتا ہے۔جب ہم طنز ومزاح کے ذریعے معاشرے پر تنقید کرنے والے مزاح نگاروں کے متعلق سوچتے ہیں تو ابنِ انشاء ان میں بہت نمایاں اور عوام میں مقبول نظر آتے ہیں۔

انوکھا کام کرنے کا عزم رکھنے والی رضیہ اسماعیل کی شاعری روایتی ہونے کے باوجود شکوہ وشکایت والی شاعری نہیں ہے۔ان کے اشعار ان کے عزم اور حوصلے کا پیغام دیتے ہیں۔وہ عورت ہونے پر کمزوری کا اظہار نہیں کرتیں بلکہ کہتی ہیں:

انوکھا کام کرنا چاہتی ہوں
زمانے کو بدلنا چاہتی ہوں
ستم کو ، جور کو ، سب نفرتوں کو
محبت سے نمٹنا چاہتی ہوں

رضیہ نے عورت کے ہر پہلو کو بہت شدت سے محسوس کیا ہے اور ان کے اشعار سے معاشرے کے رویے پر ان کا دکھ ظاہر ہوتا ہے۔نہ صرف اپنے ملک میں عورت کے ساتھ ہونے والے سلوک کو بلکہ اس دنیا کی ہر عورت کے دکھ کو انھوں نے محسوس کیا اور ان کے خیالات ان کی شاعری کا موضوع بنے۔ان کی نظم ''خوش قسمت'' میں عورتوں کی ذات سے

متعلق وہ سارے نام دیتی ہیں جو معاشرہ عورتوں کو بخشتا ہے:

ہمارے کتنے ہی نام ہیں
مجبور عورتیں، محصور عورتیں
لاچار عورتیں، ریاکار عورتیں
گنہگار عورتیں، کم فہم عورتیں
کم نظر عورتیں، بدگماں عورتیں
بے صبر عورتیں، بدزباں عورتیں

لیکن خود اعتمادی کا یہ عالم کہ

گلابوں کو تم اپنے پاس رکھو
مجھے کانٹوں پہ چلنا آ گیا ہے

ایک اور نظم ''مجھے بولنا کیوں سکھایا'' میں زباں بندی پر سارے شکوے شکایت کے بعد:

اگر میں دل کی بات نہیں کہہ سکتی
تو مجھے بولنا کیوں سکھایا گیا

میرے ذہن میں ایک خیال چٹکی لیتا ہے کہ درست، یہ شعر رضیہ اسماعیل کا شاعرانہ تصور ہے مگر یقیناً ہر عورت کی زندگی میں ایک سے زیادہ ایسا موقع آیا ہوگا جب اس کے دل میں بھی یہی سوال آیا ہوگا۔ کم از کم ایشیائی عورت کے لئے تو یہ بات کہی جا سکتی ہے۔

ان کے شعری مجموعے ''گلابوں کو تم اپنے پاس رکھو'' کے تعارف میں عدیم ہاشمی صاحب تحریر کرتے ہیں:

''غزل کی زبان کی سلاست اور روانی کے ساتھ جو تخلیقی بہاؤ ہے وہ یقیناً کسی بھی لکھنے والے کے لئے قابلِ رشک حیثیت رکھتا ہے۔''

نثر نگاری اور شاعری کے علاوہ رضیہ اسماعیل ایک سوشل ورکر بھی ہیں اور اپنی کمیونٹی

کے لئے خصوصاً ایشیائی عورتوں کے لئے کام کررہی ہیں۔انھوں نے ''آ گہی'' کے نام سے ایک تنظیم قائم کی جوایک تحریک بن گئی ہے۔''آ گہی'' کی اپنی ایک ویب سائٹ ہے جس پر ''یوتھ سیکشن'' اور ''اُردو سیکشن'' کے عنوان سے سیکشن قائم کیے گئے ہیں۔یوتھ سیکشن کی ریورس ڈائریکٹری میں ایڈوائس اور سپورٹ، الکوحل اور ڈرگ ابیوز، برمنگھم سٹی کونسل، کیریئرز، معذوری، تعلیم، خواتین، نوجوانوں اور مفید رابطوں کے لئے پتے اور لنکس وغیرہ سب تفصیلات مہیا کی گئی ہیں۔نوجوان خواتین کے لئے ''آ گہی ہیلپ لائن'' کا آغاز بھی ہوا ہے۔اُردو سیکشن میں برطانیہ کی خواتین رائٹرز کے نام، ان کی تصانیف کے نام اور شاعرات کے کلام کے مختصر نمونے بھی ویب سائٹ میں موجود ہیں۔''آ گہی'' کے زیرِ اہتمام سماجی تقریبات اور پوئٹری ورک شاپ وغیرہ منعقد ہوتی رہتی ہیں جس سے برمنگھم میں رہائش پذیر ہماری تیسری نسل کے نوجوان یقیناً مستفید ہوتے ہوں گے۔

کہاوت ہے کہ ہر کامیاب مرد کے پیچھے ایک عورت ہوتی ہے۔اور یہی بات ایک کامیاب عورت کے لئے بھی کہی جا سکتی ہے۔مگر یہ بات مجھے لگتا ہے کہ کسی مغربی مرد یا عورت کی کہی ہوئی ہے۔ہمارے ہاں تو ہر کامیاب انسان کے پیچھے نہ صرف شوہر یا بیوی بلکہ بچے، ماں باپ اور سارا کنبہ ہوتا ہے۔سب اس کے کام میں دل چسپی لیتے ہیں اور حتی الامکان مدد کرتے ہیں۔اگر دور ہیں تو دعاؤں میں شامل رکھتے ہیں۔مجھے یقین ہے کہ رضیہ اسماعیل کی ان سب کامیابیوں میں ان کے خاندان کا بھی ہاتھ ہے اور خاندان کی مدد اور دعا حاصل ہونے سے خدا کا فضل بھی شاملِ حال ہوتا ہے۔رضیہ اسماعیل ریسرچ بھی کررہی تھیں اور ان کو ڈاکٹریٹ کی سند بھی مل چکی ہے۔میری جانب سے بہت بہت مبارک باد......

صفیہ صدیقی

(لندن)

آ گہی کی روحِ رواں

دو تین سال پہلے مجھے برمنگھم سے خواتین کی ایک انجمن ''آ گہی'' کی طرف سے مشاعرے پر مدعو کیا گیا۔ لائبریری کے خوب صورت تھیٹر ہال میں محفلِ مشاعرہ سجی تھی۔ ہال کو بہت خوب صورتی سے سجایا گیا تھا۔ مائک پر ایک مترنم آواز گونجی تو پتا چلا کہ یہ رضیہ اسماعیل ہیں ...... ''آ گہی'' کی روحِ رواں۔ خوب صورت خدو خال کی مالک، چہرے پر بڑی بڑی آنکھیں، دھیما لہجہ اور آواز کی ادائیگی جیسے کوئی موتی پرو رہا ہو۔ ایک ایک شعر پر داد وصول کرتی رہیں۔ یہی میری ان سے پہلی ملاقات تھی۔ مشاعرہ کامیاب رہا اور میں رضیہ اسماعیل کی مدّاح ہوگئی۔

اسی طرح کی کئی شامیں وہ منعقد کرتی رہیں اور یہی شامیں نئی نسل کے شعرا، افسانہ نگاروں اور ڈراما نویسوں کے بھرپور تعارف کا ذریعہ بنی ہیں۔ رضیہ اسماعیل کے کئی مجموعۂ کلام شائع ہو چکے ہیں۔ ان کے لہجے نے فکر آور اسلوبِ اظہار اور جدید حسیت کے وہ چراغ جلائے ہیں کہ ان کا پورا کلام اُس سے منور ہے۔ ان کی نظم اور غزل کا ایک ایک حرف گواہی دے رہا ہے کہ وہ تخلیقِ فن کی بھٹی سے کندن بن کر نکلا ہے۔ ان کا کلام دلوں پر اثر کرتا ہے۔ وہ منفرد لب ولہجہ کی شاعرہ ہیں اور ادبی دنیا میں ایک اہم مقام رکھتی ہیں۔ شاعری میں وہ نئی نسل کی بھرپور ترجمانی کرتی ہیں۔ کبھی کبھی وہ انتہائی رنجیدہ دکھائی دیتی ہیں۔ حزن و ملال اور رنج میں ڈوبی ہوئی شاعری نوجوانوں میں ایک تلاطم پیدا کر دیتی ہے۔ وہ غمِ جاناں

اور غمِ دوراں سے گزر چکی ہیں۔ ہر طرح کی آسائشیں میسر آنے کے باوجود وہ اپنی روایات، رسم و رواج اور بے وطنی کا کرب شدت سے محسوس کرتی ہیں۔ اپنے ہم وطنوں کے لئے ان کے دل میں پیار کی تپش ہے۔ اسے یخ بستہ ہوائیں سرد نہیں کر سکیں۔ عورتوں کے مسائل کو اچھی طرح سمجھتی ہیں اور ظلم اور ناانصافی کے خلاف آواز اٹھاتی ہیں کیوں کہ وہ خود ایک مشرقی عورت اور ماں ہیں۔

ان کی کتابوں کی رونمائی لندن میں بھی ہوئی۔ بہت پذیرائی ہوئی۔ ان کے کلام کو سراہا گیا۔ ان کی ایک کتاب ''چاند میں چڑیلیں'' کے حوالے سے ایک صاحب نے کہا، ''رضیہ صاحبہ، چڑیلیں ڈھونڈنے کے لئے چاند میں جانے کی کیا ضرورت ہے جب کہ......'' اور محفل کشتِ زعفران بن گئی۔

وہ مشاعروں میں بہت کم دکھائی دیتی ہیں کہ مشاعرہ پڑھنے سے کوئی بڑا شاعر نہیں بن سکتا بلکہ فنی صلاحیت اور تخلیق اسے معیار عطا کرتی ہے۔

ان کے اشعار میں آشوبِ آگہی کے شواہد ملتے ہیں۔ آج کل وہ ''آگہی'' کے لئے بہت کام کر رہی ہیں اور اُردو کی ویب سائٹ حال ہی میں ریلیز کی ہے۔

رضیہ اسماعیل کی شاعری باطن کی ایک نرم و نازک اور بے چین صدا ہے۔ نظم اور غزل پر ان کی گرفت بہت مضبوط ہے۔ میں ان کا یہ شعر اکثر گنگناتی ہوں۔

اے کاش سرِ صحرا اک پھول کھلا ہوتا
اس پھول کے پہلو میں اک دیپ جلا ہوتا

پاکیزہ بیگ
(لندن)

کاغذ سے اٹھتا شور.........

کبھی یوں ہوتا ہے کہ کسی انجانی آواز میں اتنی اپنائیت ہوتی ہے وہ اتنی جانی پہچانی سی لگتی ہے جیسے مدت سے شناسائی ہو۔اس کے خلوص کی شبنم دل کی پنکھڑیوں کوتر بہ تر کردیتی ہے۔ کچھ سال پہلے جب میں لندن گئی تھی تو فون پر ایک ایسی ہی پرخلوص آواز نے متاثر کیا تھا۔ یہ آواز تھی رضیہ اسماعیل کی۔ان کے اخلاق کی انتہا یہ تھی کہ برمنگھم سے لندن وہ اپنی مصروفیت کے باوجود وقت نکال کر مجھ سے ملنے دنیائے شعروادب کے فنکشن میں آ گئیں جہاں میری کتاب کرچیاں کی رونمائی تھی۔اس پرخلوص اور عمدہ فنکارہ سے میری ملاقات اردو دنیا کے مشہور ادیب وشاعر حیدر قریشی صاحب کے ذریعہ ہوئی تھی جن کی میں بہت ممنون ہوں۔ یہ ملاقات بہت مختصر تھی۔اس وقت انہوں نے مجھے اپنا خوبصورت اور خوب سیرت مجموعہ.........سب آنکھیں میری آنکھیں ہیں.....عطا کیا تھا۔ان سے میری دوسری ملاقات ۲۰۰۸ میں ہوئی تھی۔ میں ان دنوں لندن میں تھی اور رضیہ نے بے حد خلوص ومحبت کے ساتھ اپنی رہائش گاہ پر میرے لیے ایک حسین اور یادگار ادبی شام منائی تھی۔اس ملاقات نے اس پرخلوص شخصیت کی خوبیوں کی اور بھی تہیں کھولی تھیں۔ مجھے وہ اس کوزہ گر کی مانند نظر آئیں جو کچی مٹی کی لوئی سے بغیر کسی چاک کے صرف اپنے ہاتھوں سے شاہ کار تخلیق کردیتا ہے۔ انہونی کو ہونی بنادیتا ہے۔رضیہ کی یہ تخلیقات ان کی بیٹیاں ہیں جنھیں ناسازگار ماحول میں رہ کر بھی، وطن سے دور رہ کر بھی انہوں نے اپنی تہذیب وتمدن کا نمونہ بنادیا ہے۔

اچھا فن کار کوئی ضروری نہیں کہ اچھا انسان بھی ہو۔ رضیہ اسماعیل ایک بہت اچھی تخلیق کار ہونے کے ساتھ ساتھ ایک بہت با اخلاق اور نیک دل خاتون ہیں۔ ان کے دل کا پیمانہ مظلوم عورتوں کے اشکوں سے لبالب ہے جو ان کے اشعار سے چھلک رہا ہے۔ تخلیق شخصیت کا آئینہ ہوتی ہے۔ فن کے بطن سے زندگی کا سچ نمودار ہوتا ہے جو رضیہ کی شاعری میں جھلک رہا ہے۔ جنسی تعصب کی نا انصافیوں نے انسانیت کو دو حصوں میں تقسیم کر دیا ہے۔ عورت ہمیشہ تشدد سے بھرپور نظامات کی شکار ہے۔ مرد اساس معاشرے کی زیادتی کے پتھروں سے زخمی ہے۔ بے بسی اپنا سر طاقت کی سنگلاخ دیواروں پر پٹکتی ہے جو اس کا راستہ روکے کھڑی ہیں لیکن دیوار طنزیہ مسکراہٹ کے ساتھ مضبوطی کے ساتھ قائم رہتی ہے سر چکنا چور ہو جاتے ہیں۔ ان محسوسات کی بھرپور کیفیت رضیہ کے ان اشعار میں موجود ہیں......

سوچ کے بادباں کھول دو
سر اٹھا کے بہت ناز سے جانے والی ہوا نے کہا
سن کے پیغام یہ
سوچ بھی سوچ میں پڑ گئی
میں تو صدیوں سے زندان خانوں میں ہوں
لب سلے ہیں مرے
ہاتھ جکڑے ہوئے
پاؤں میں بیڑیاں
نرم و نازک سراپا ہے اک آبلہ
سلسلہ ظلم کا ہے کہ رکتا نہیں
سوچ کے بادباں
اس ہوا
اس فضا میں

کھلیں بھی تو کیسے کھلیں

مجھ کو تو ہی بتا

عورتوں کے درد کا لہوان اشعار کی رگوں میں بھی دوڑ رہا ہے......

عورتوں کی قبروں پر ایستادہ

بڑے بڑے کتبوں کو دیکھ کر

سوچتی ہوں

اس قبر پر اتنی عنایت کیوں؟

کیا یہ کتبے

محبتوں کے مظہر ہیں یا

احساس جرم کے کفارے

جو موت کے بعد ادا کیے جا رہے ہیں؟

انہوں نے اپنا ایک اور مجموعہ .... پیپل کی چھاؤں میں .... مجھے عنایت کیا تھا۔ اس کے مطالعے کے بعد رضیہ کی ایک اور جہت جگمگائی۔ یہ ان کے ماہیوں کا مجموعہ تھا۔ حیرت انگیز خوشی ہوئی کہ ماہیا نگاری میں بھی مکمل مہارت رکھتی ہیں۔ان کا درد مند دل اور اس کے احساسات محض ذاتی نہیں بلکہ کائیناتی ہیں۔اس کا ایک اور ثبوت رضیہ کا محبت سے بھرپور وہ خط ہے جو میری والدہ کے انتقال پر انہوں نے مجھے لکھا تھا مجھے ایسا لگا تھا کے میرا درد ان کا بھی درد بن گیا تھا۔ سچے خلوص اور ہم دردی سے لبریز اس خط میں انہوں نے چند اشعار ماں کے لیے درج کیے تھے۔ ان کے یہ ماہیے صرف ان کے نہیں ہر دل کی داستان ہیں...........

اس جگ کا نور ہے ماں

رب کے بعد یہاں

دوجے رب کا ظہور ہے ماں

ہر طرف بلائیں تھیں
بچ کر نکل گئے
سب ماں کی دعائیں تھیں

ہائے کتنی گرمی ہے
چھاؤں ممتا کی
پھولوں سی نرمی ہے

میرے خیال میں شاعری کی سب سے بڑی توانائی وہ ہے جو یوں بے چین کر دے کہ یہ تو میرے ہی دل کی آواز ہے....... یہ تو میری ہی واردات قلب ہے........ یہ تو میرے ہی محسوسات اور تجربات ہیں..... یہ تو میرا ہی درد ہے! رضیہ کی کئی نظموں نے مجھے اسی طرح بے چین کیا ہے۔ خاص طور سے یہ اشعار.........................

خوشی

بدصورت پاؤں والا
وہ پرندہ ہے
جو ناچتے ناچتے
اپنے پاؤں دیکھ کر
اداس ہو جاتا ہے
اور ناچنا چھوڑ کر
کونے میں جا بیٹھتا ہے

روح

خوابیدہ وجود کو

نہ جانے کہاں
اڑائے اڑائے پھرتی ہے
بدن نیند سے بیدار ہوتا ہے
روح قیدی بن جاتی ہے
رات روح کا رتجگا ہے
دن کی روشنی
روح کا میلہ
اجاڑ دیتی ہے

ہماری سوچوں میں
زندگی اور موت کا فاصلہ ہے
مہد سے لحد تک کی دوریاں ہیں
اندھیرے سے روشنی تک کی
جدائیاں ہیں
بہار کی پہلی کلی چٹکنے سے لے کر
خزاں میں آخری پتہ گرنے تک کا
ماتم ہے
دھرتی کی مٹیالی رنگت اور
آسمان کی نیلاہٹوں کا فرق ہے
آنسوؤں سے ہنسی تک کا سفر ہے
خواب سے تعبیر تک کا خوف ہے
بلندی اور پستی کا خلا ہے

یقین کے جنگل سے بے یقینی تک کے صحرا کی ریت ہے

ہوش وخرد سے

جنون ومستی تک کا بحر بیکراں ہے

شاید

ہمارے ستارے نہیں ملتے

رضیہ کے لیے کائنات ایک حیرت کدہ ہے۔جب چشم باطن وا ہو جائے تو سچ کے کئی دریچے کھل جاتے ہیں۔علم کے نور سے روح روشن ہو جاتی ہے۔تاریکی کی فصیلیں ڈھے جاتی ہیں۔آگہی کا شور کاغذ سے لپٹ جاتا ہے......

پروین شیر
(کنیڈا)

ایک حسّاس اور دردمند روح

ریڈیو سے ایک سحر خیز آواز اٹھا کرتی تھی۔ وہ وہ آواز ایک سمعی سا جادو لگتی تھی۔ مجھے اس سے کچھ شناسائی سی ہوگئی۔ اس آواز میں ایک پیغام ہوتا۔ کبھی زمانے کے نام، کبھی زمانے والوں کے نام۔ کبھی گلوں کے نام، کبھی گل چیں کے نام۔ کبھی ظالم کے نام، کبھی مظلوم کے نام۔ کبھی اسیرانِ خانہ داری کے نام اور کبھی جابر مردوں کے نام۔ وہ آواز کبھی غزل بن کر افق پر تھرتھراتی، کبھی نظم بن کر سامعین کے دلوں کو لوٹتی۔ اس آواز میں ایک غیر معمولی جاذبیت تھی، ایک گہرا جذبہ تھا۔

ایک دن ایک مقامی مشاعرہ میں حصہ لینے گیا تو میری ملاقات اس آواز سے ہوئی۔ میری خوشی کی انتہا نہ رہی کہ اتنے عرصہ سے میری پسندیدہ آواز بنفسِ نفیس وہاں موجود تھی۔ وہ خوش پوش خاتون رضیہ اسماعیل اپنے گرد ایک خوب صورت ہالہ لیے ہوئے کتنی روشن لگ رہی تھی۔ ملاقات ہوئی، آغازِ شناسائی تو شاعری کے توسط سے ہوا لیکن رضیہ اسماعیل کی شخصیت کے دوسرے پہلو آہستہ آہستہ مجھ پر کھلے۔

وہ حسّاس طبع انسان، جس کے کردار سے گرم جوشی اور افکار سے محبت ٹپکتی ہے، وہ لوگوں کے لئے کیا نہیں کرتی۔ مجھے اکثر خیال آتا ہے کہ وہ ان تمام سرگرمیوں کے لئے وقت کیسے نکال لیتی ہیں۔

رضیہ اسماعیل شاعرہ بھی ہیں اور ادیبہ بھی۔ نثر میں کمال کرتی ہیں۔ طنز و مزاح میں

یدِطولیٰ رکھتی ہیں۔اُردو ماہیے کو انگلستان میں رضیہ اسماعیل نے بہت تقویت پہنچائی ہے۔وہ برطانیہ میں پہلی ماہیا نگار صاحبِ کتاب خاتون ہیں۔

رضیہ اسماعیل خدا کے فضل اور اپنی محنتِ شاقہ سے اب ڈاکٹر رضیہ اسماعیل ہوگئی ہیں۔ ان کے ادبی رجحان سے ہٹ کر ان میں روحانیت بھی کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی ہے۔ان کو اللہ تعالیٰ کی قدرتوں کا فوق العموم مشاہدہ ہوتا ہے۔محسوس یوں ہوتا ہے کہ ان کو دلِ پُر درد، چشمِ بینا اور طبعِ نازک دے کر ہر قسم کی خدمت پر مامور کیا گیا ہے۔

آج کل کی انٹرنیٹ کی دنیا میں ڈاکٹر رضیہ اسماعیل نے اپنی ویب سائٹ (www.aaghee.co.uk) کو اتنی کارآمد معلومات سے لاد دیا ہے کہ لامحالہ اس کو دن میں ایک دو بار ہر کوئی استعمال کرتا ہے۔شاعری میں کش مکشِ زندگی کے کئی فلسفے بیان کرتی ہیں۔ایک یہ ہے:

اندھیرا وقتی طور پر
روشنی کو سمیٹ سکتا ہے
لیکن سدا کے لئے روشنی کو
اپنی بانہوں میں قید نہیں کرسکتا
روشنی کی بے قراریاں......
اندھیرے کا وجود چھلنی کردیں گی
دریدہ بدن اندھیرا......
پھر روشنی سے کیسے نظر ملائے گا!

اور پھر ایک جگہ لکھا ہے کہ:

کوہ قاف میں جا کر
بونے......

دیکھنے کی مجھے بہت خواہش تھی
دنیا میں......
قدآور لوگوں کو قریب سے دیکھا
میری خواہش کی تکمیل ہوگئی!
مجھے ڈاکٹر رضیہ اسماعیل سے شناسائی پر فخر ہے۔

قاضی عنایت الرحمٰن
(برمنگھم، برطانیہ)

رضیہ۔ میری سہیلی

رضیہ سے مل کر دل خوش ہوتا ہے۔ سلجھی ہوئی طبیعت، اپنائیت بھرا روّیہ، میٹھی باتیں، دل نشیں لہجہ، ٹھہرا ٹھہرا سا مزاج، شائستہ انداز، علمی و ادبی گفتگو ہو تو ڈوب جانے والی کیفیت، خواتین کا تذکرہ ہو تو

وہ کہیں اور سنا کرے کوئی

ان کے دل کی دنیا سارے اسرار و رموز سے آشنا، ان پر گزرنے والی کیفیات سے واقف، بڑے ہی دردمندانہ احساس کے تحت، ان کے لئے کچھ کرنے، کرتے رہنے اور کر جانے کی تمنا میں کیا کیا کچھ سوچتی، کہتی، کرتی، کرواتی، لکھتی، اپنے ''آگہی'' پروجیکٹ کے لئے لکھواتی، چھپواتی، لائق فائق اور محنتی خاتون ہیں۔ یہ ہیں میری سہیلی (جانے اب لوگ ''دوست'' کیوں کہنے لگے ہیں) رضیہ اسماعیل۔

منظّم گھر داری، بچیوں کی پرورش اور محکمۂ تعلیم میں ملازمت کے ساتھ ساتھ انھوں نے پی ایچ ڈی کر کے خود کو ڈاکٹر رضیہ اسماعیل بنالیا ہے...... ہے نا کارنامہ!

بعض لوگ، بلکہ بہت سے لوگ بہت کچھ سوچتے ہیں اور سوچتے ہی رہ جاتے ہیں۔ کئی ایک کچھ کرنے کی باتیں کرتے ہیں اور کرتے ہی رہ جاتے ہیں۔ مگر رضیہ کچھ نہ کچھ کرتی بھی رہتی ہیں۔ سنا ہے صبح منہ اندھیرے لکھنے کی میز پر بیٹھ جاتی ہیں اور شام، کاموں سے فراغت پاتے ہی پھر وہی کچھ۔ جبھی تو ٹیلی فون کریں تو ان کی آواز کی بجائے اکثر اسماعیل صاحب کی آواز آنسرنگ مشین (Answering machine) سے سنائی دیتی ہے۔

رضیہ بڑی دوستانہ طبیعت کی مالک ہیں۔ اپنی اپنائیت سے ملنے والوں کو گرویدہ بنا لیتی ہیں۔ سیدھی سچی بات کرتی ہیں، خود مخلص ہیں، دوسرے سے بھی یہی توقع رکھتی ہیں۔ کہیں ادبی مخاصمت، منافقت، گروہ بندی کا مظاہرہ دیکھیں تو اندر ہی اندر کڑھتی ہیں اور ایسی محفل سے کنارہ کشی کرنے میں ہی اپنی عافیت سمجھتی ہیں۔

اُردو کے تیسرے بڑے مرکز برطانیہ کی ادبی محفلوں اور مشاعروں میں سفید اور نیم سفید سروں کی قطاریں انھیں بھی اُردو کے مستقبل کی طرف سے متفکر کیے رکھتی ہیں۔ نئے چراغوں کی جستجو میں نوجوانوں کو لکھنے لکھانے کی طرف راغب کرنے کی کوشش میں بہت کچھ کرتی چلی آ رہی ہیں۔ نوجوان بچیوں کے لئے مقامی لائبریریوں میں ادبی ورک شاپس منعقد کرنے کا سلسلہ رضیہ ہی کی ذہنی اپچ ہے۔

رضیہ نے باہر تو جو اُجالا پھیلایا سو پھیلایا، ان کے اندر کی دنیا بڑی روشن ہے۔ شعر و شاعری اور مضامین کے مجموعوں کے ساتھ ساتھ، قسم قسم کے درود شریف جمع کر کے بڑی محبت اور محنت کے ساتھ ان کا ترتیب دیا ہوا خوب صورت مجموعہ دیکھ کر سوچتی ہوں کہ دینی و دنیاوی دل چسپیوں کا کیسا حسین امتزاج ہے ان کی طبیعت میں۔

رضیہ اوپر سے بڑی سنجیدہ نظر آتی ہیں، بیحد متین سی۔ ان کی حسِ مزاح کا اندازہ تو ان کی گفتگو سے ہوتا ہے۔ ہاں ''چاند میں چڑیلیں'' کے طنزیہ مضامین سے ان کی طبیعت کی فطری شگفتگی کا اندازہ ہوتا ہے۔

رضیہ میری سہیلی ہیں۔ یہ بات میرے لئے بڑی مسرت کی بات ہے۔ ایک بہت اچھی خاتون ہونے کے ساتھ ساتھ اتنی اچھی ادیبہ، شاعرہ، سماجی کارکن، ماہرِ تعلیم اور کیا کیا کچھ۔ مجھے فخر ہے کہ رضیہ میرے حلقۂ احباب میں شامل ہیں۔

طلعت سلیم

(برمنگھم، برطانیہ)

کانٹوں پہ چلتی رضیہ اسماعیل

گلابوں کو تم اپنے پاس رکھو
مجھے کانٹوں پہ چلنا آ گیا ہے

اس شعر کے پس منظر کو دیکھنا ہے تو رضیہ اسماعیل کی کتاب ''گلابوں کو تم اپنے پاس رکھو'' کو پڑھنا پڑے گا۔ کیوں کہ انھوں نے اپنی نظموں میں عورت کے المیوں کی داستان بیان کی ہے اور ان کے دُکھ سے گزر کر یہ شعر کہہ رہی ہیں۔

رضیہ اسماعیل کا تعلق پنجاب سے ہے اور برطانیہ میں مقیم ہیں۔ بطور شاعرہ وہ صرف شاعری تک ہی محدود نہیں بلکہ برمنگھم میں ادبی سماجی تنظیموں کے لئے دونوں شعبوں میں بھی خدمات سرانجام دے رہی ہیں۔ وہ دیگر تنظیموں کے علاوہ خواتین کی ادبی ثقافتی تنظیم ''آگہی'' کی صدر ہیں۔ براڈ کاسٹنگ کے شعبہ سے بھی وابستہ رہ چکی ہیں۔ شاعری کے علاوہ نثر میں بھی طبع آزمائی کرتی ہیں اور نثر میں طنز و مزاح لکھ رہی ہیں۔ برطانیہ میں سول سروس میں شمولیت کی، پھر ٹیچر ٹریننگ کے بعد سوشل ورک میں ایم اے کیا اور محکمہ تعلیم میں ذمہ دار عہدے پر فائز ہیں۔ ان کے تعلیمی پس منظر میں ان کی شاعری کو دیکھا جائے تو ایک خاص زاویہ سامنے آتا ہے اور وہ ہے شعور اور ادراک کا رویہ۔ رضیہ اسماعیل کی کتاب میں پینتیس نثری نظمیں، اٹھائیس غزلیں اور آٹھ آزاد نظمیں شامل ہیں۔ اس طرح اس کتاب کو

نثری نظموں کا مجموعہ کہا جا سکتا ہے جس میں ذائقہ بدلنے کے لئے غزلیں اور آزاد نظمیں شامل ہیں جو ان کی فن پر دسترس کا ثبوت ہیں۔نثری نظم کا حوالہ اُردو ادب میں اتنا مقبول نہیں ہوایا پھر اس صنف کو بہتر طور پر سمجھا ہی نہیں گیا۔

ایک مرتبہ کشور ناہید سے نثری نظم کے بارے میں سوال کیا گیا، ''کیا شاعری کی یہ صنف بہت آسان ہے، اسے ہر کوئی لکھ سکتا ہے؟'' عمومی طور پر یہ ہی سمجھا جاتا ہے کہ نثری نظم لکھنا بہت آسان کام ہے، بس خیال ذہن میں آیا اور پھر اس کی مناسبت سے الفاظ کا چناؤ کیا اور ان کو خاص ٹکڑوں کی صورت میں لکھ لیا، یہ نثری نظم بن گئی۔کشور ناہید نے اس کی وضاحت کچھ یوں کی کہ ''نثری نظم لکھنا اتنا آسان نہیں جتنا سمجھ لیا گیا ہے۔ایک اچھی اور مؤثر نثری نظم اس وقت تک نہیں لکھی جا سکتی ہے جب تک لکھنے والا شاعری کے رموز سے واقف اور اس کی سوچ میں گہرائی نہ وہ۔ جہاں دونوں باتیں ہوں، وہیں اچھی اور پختہ نثری نظم تخلیق ہوتی ہے۔''

رضیہ اسماعیل کی کتاب میں غزلیں اور نظمیں اس بات کا ثبوت ہیں کہ وہ شاعری کے رموز سے آگاہ ہیں، اور جب شاعری کے رموز سے آگاہ ہیں تو بات سوچ کی رہ گئی۔سوچ ہر انسان کی مختلف ہوتی ہے۔ ہر واقعہ، ہر کردار اور زندگی کی اونچ نیچ کو وہ اپنے انداز میں دیکھتا ہے، اس کا تجزیہ کرتا ہے۔تخلیق کار کے ان تمام باتوں کو دیکھنے کا انداز قدرے مختلف ہوتا ہے۔ وہ واقعہ کے پس منظر اور اس کے اثرات کا بغور مشاہدہ کرتا ہے، یا پھر وہ اپنے تجربات کو رقم کرتا ہے اور نثری نظم اسے اپنے تجربات اور مشاہدات بیان کرنے کی آزادی دیتی ہے۔

جہاں تک نثری نظم کی اصطلاح کا تعلق ہے، تو ڈاکٹر ابن فرید نے اپنے ایک مضمون

میں لکھا ہے، ''اسے تو قبول کرنا ہی پڑے گا کیوں کہ یہ اصطلاح اب تقریباً تین چوتھائی صدی کے قریب پرانی ہونے کو آرہی ہے اور اس پر خاصا کام بھی ہو چکا ہے۔ اور ویسے بھی Prose Poetry کا ''نثری نظم'' کے علاوہ کوئی اور ترجمہ ہو بھی نہیں سکتا۔'' ابن فرید نے جس وقت یہ مضمون تحریر کیا ہوگا تو اس وقت یقیناً تین چوتھائی صدی ہی ہوئی ہوگی مگر اب تو اس بات کو ایک صدی سے زیادہ عرصہ گزر چکا ہے اور اس صنف میں نئے نئے نام سامنے آئے ہیں۔

رضیہ اسماعیل کی نثری نظمیں پڑھنے کے بعد احساس ہوتا ہے کہ ان کی نظمیں عورت کے گرد گھوم رہی ہیں، جس میں عورت کی مظلومیت، بدلتے رشتے اور رشتوں کے بدلتے رویے خاص طور پر محسوس کیے جاسکتے ہیں۔ انھوں نے اپنی نظموں میں عورت کو موضوع بنا کر جو تصویر کشی کی ہے وہ برطانیہ میں رہتے ہوئے بھی ہمارے معاشرے کی عورت کی تصویر ہے۔ بادلیر اور میلارمے کا کہنا ہے کہ ''انسان کے تین رشتے ہیں اور وہ ہیں تنہائی، جنس اور مایوسی۔ یہ ازلی ابدی رشتے ہیں۔'' اس بات کی روشنی میں بھی اگر ان کی نظموں کو دیکھا جائے تو وہ انہی تین رویوں کے گرد گھومتی نظر آئیں گی۔ رضیہ اسماعیل کی نظموں میں مایوسی بھی ہے جو معاشرے نے عورت کو دی ہے۔ اس تناظر میں ان کی ایک نظم ''دردِ دل'' کے آخری مصرعے ہیں۔

کوئی جھونکا ہی ہوا کا
اسے لرزا دے گا
جس کی بنیاد ہی بے چینی ہو
بے یقینی کی ہر اک خشت لگی ہو جس میں
ایسی بنیاد پہ کیا کوئی عمارت ٹھہرے

اس طرح کے رویے ان کی کئی نظموں میں نظر آتے ہیں، مگر جہاں تک عورت ہونے کا سوال ہے، وہ اس کے ہر رشتے پر، جو کہیں ماں ہے، کہیں بہن، کہیں بیٹی اور کبھی بیوی کے روپ میں ہوتی ہے، نازاں ہیں۔ یہی موضوع ان کی نظموں میں موجود ہے جو ساتھ ساتھ چلتا ہے۔

راشد، قیوم نظر، یوسف ظفر اور مجید امجد کی شاعری میں بھی یہی تینوں رویے ''مایوسی، جنس اور تنہائی'' اور بین الاقوامی فلسفوں اور تحریکوں کے اثرات جدید اُردو شاعری کا فکری نظام بناتے ہوئے ابتدائی صورت میں نظر آتے ہیں اور پھر آہستہ آہستہ جنس اور گھٹن نئی شاعری کی زیریں رو بن کر سامنے آتی ہے۔ راشد کی شاعری میں سیاست اور میراجی کی شاعری کی جنس نمایاں ہے۔ اسی طرح فہمیدہ ریاض کی شاعری میں جنس کے نمایاں حوالے ملتے ہیں۔ گو کہ رضیہ اسماعیل کی شاعری میں جنس کا عنصر کم ہے مگر کہیں کہیں اس کی جھلک عورت کے رشتے اور رویے کے حوالے سے نظر آتی ہے۔ ان کی آزاد نظم ''سیج'' اسی انداز کا ایک پہلو ہے۔

پیار کی سیج پر

دو بدن

کتنے ارماں سجا کر ملے

وہ یہ سمجھا کہ عورت کو سر کر لیا

کتنا نادان ہے

کتنا انجان ہے

عورت سے تعلق، ان کی مجبوری اور رشتوں کے خاص بندھن کے حوالے سے رضیہ

اسماعیل نے بڑی بے باکی سے لکھا ہے۔ وہ اس معاشرے میں پسی ہوئی عورت پر ہونے والے ظلم اور ایک سے تعلق قائم ہونے، جو مرد اور عورت کے حوالے سے سامنے آتے ہیں، دو رویوں اور معاشرے کی منافقت کو ''عورت کا گناہ'' میں نظم کرتی ہیں۔

عورت کا گناہ

میرے گناہ کی عمر

کیوں اتنی طویل ہے!

میرے شریکِ گناہ نے

پیار کے نام پر......

میری عصمت کی چادر تارتار کی

کبھی نہ آنے والے کل کی امید پر

ایک گھر کے سپنے دکھا کر

امیدوں کے گلشن کو خاکستر کیا

وہ تو اپنا کام کر کے چلا گیا

مگر میرا گناہ...... میرے پیٹ میں

آلتی پالتی مار کر کیوں بیٹھ گیا ہے؟

میری کوکھ میں سڑاند کیوں؟

میں ماں تو بننا چاہتی تھی

مگر......

اب میرا ماں بننا باعثِ عبرت ہے

میں ننگِ خاندان، حوّا کی بیٹی

سنگسار کیے جانے کے لائق

مگر......

اس گناہ کی سزا صرف مجھے کیوں؟

اسے کیوں نہیں؟

صرف اس لئے کہ

میرا گناہ ظاہر ہے

اور اس کا پوشیدہ......!

اس کا گناہ رات کی تاریکی میں تحلیل ہو گیا

اور میرا گناہ......

دن کے اُجالے میں ظاہر ہو گیا!

اُردو ادب میں نثری نظم کو اس طرح تسلیم نہیں کیا گیا جیسے بہت سی ''درآمد شدہ'' جدید اصناف نے اپنے لئے جگہ بنائی ہے۔ نثری نظم یہاں کے ماحول کے لئے اجنبی ہے اور اپنی جگہ بنانے میں خاصی دشواریوں کا سامنا کر رہی ہے۔ لیکن انگریزی ادب میں یہ تجربہ نیا نہیں۔ وہاں یہ یقیناً ایک پختہ صنف ہے۔ اس کے بارے میں ایلیٹ نے بھی لکھا ہے کہ ''شاعری کی معراج نثری نظم ہے۔'' یہ الگ بات کہ اردو ادب میں ایسا بڑا نام نثری نظم کے حوالے سے سامنے نہیں آ سکا جس کا حوالہ صرف نثری نظم ہی ہو۔ کیوں کہ اس صنف کے یہاں آتے ہی اس کی مخالفت نے اسے اس طرح پنپنے نہیں دیا جس طرح دیگر اصناف یہاں آنے کے بعد پروان چڑھی ہیں۔

ایک انگریز نقاد نے نثری نظم کا دوسری اصناف سے موازنہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ ''نثری نظم شاعرانہ نثر سے یوں مختلف ہے کہ یہ مختصر، مربوط اور مرتب ہوتی ہے مگر آزاد نظم سے یوں مختلف ہے کہ مصرعے ٹوٹتے ہیں اور نثر پارے سے یوں مختلف ہے کہ اس میں آہنگ زیادہ واضح ہوتا ہے اور تصویر آفرینی اور قوت بھی زیادہ ہوتی ہے۔'' اس خیال کے مطابق نثری نظم ایسی ہوتی ہے جس میں نظم کی ساری خوبیاں موجود ہوں، سوائے اس کے کہ اس کے مصرعوں کو توڑ کر تحریر کیا گیا ہو۔ جہاں تک رضیہ اسماعیل کی نظموں کے خیالات کا تعلق ہے، وہ انتہائی فصیح و بلیغ ہیں اور نظموں میں سوچ کی گہرائی ہے۔

وائٹ ہیڈ کا کہنا ہے کہ ''ہر تجربہ اپنی ساخت لے آتا ہے۔'' اگر اس بات کو درست تسلیم کر لیا جاتا ہے تو یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ تجربہ ہر دور اور ہر زمانے میں بدلتا رہتا ہے۔ پرانی اصناف شاعری اس لئے مقبول ہیں کہ وہ اپنے دَور کے شعور کا حصہ تھیں اور اب وہ ہمارے ذہنوں میں رچ بس گئی ہیں۔ انسان نے جب آزادی سے سوچنا شروع کیا تو ایسی اصناف سامنے آئیں جو پابندِ سلاسل نہ تھیں۔ اور اس طرح نثری نظم بھی وجود میں آئی۔ نثری نظم نے فرانس میں جنم لیا تھا اور اس صنف نے آگے چل کر آزاد نظم کی صورت اختیار کی۔ اس طرح تاریخی طور پر نثری نظم زیادہ قدیم ہے۔ فرانس میں بعض شعراء کی نثری نظمیں بہت مقبول ہوتی تھیں۔ اسی طرح اردو ادب میں آزادی سے پہلے آصف علی نے جیل میں نثری نظمیں لکھیں اور پھر اُردو ادب کے بہت سے شعراء نے یہ تجربہ کیا جن میں افتخار جالب، مبارک احمد، کشور ناہید، عبدالرشید، سعادت سعید، فہیم جوزی، کامران جیلانی، ماورا عنایت اور دیگر شعراء شامل ہیں۔ رضیہ اسماعیل نے بھی سوچ کو قرطاس پر لانے کے لئے نثری نظم کو ذریعۂ اظہار بناتے ہوئے معاشرے میں عورت کے مقام، عورت کے عورت ہونے، اس

کے ماں بننے پر فخر کا احساس، مظلوم ہونے کا کرب، بہن اور بیٹی کے رشتے کا ادراک اور معاشرے کے برتاؤ کو خیال وفکر کے خاص زاویے اور معاشرتی حوالوں سے ہم آہنگ کیا ہے۔انھوں نے زیادہ تر نظمیں اس موضوع کے تحت لکھی ہیں۔ان کی ایک نظم ''بے گور لاش'' کے چند مصرعے مظلوم عورت کے کرب کی بھرپور عکاسی ہیں۔

بین کرتی ہوا مجھے وہ عورت لگتی ہے
جس سے گھر ہستی کا سُکھ چھین کر
دُکھوں کے کفن میں لپیٹ کر
بغیر دفنائے ہی......
قبر کے پاس چھوڑ دیا گیا ہو
کیوں کہ......
قبر میں اتارنے والے ہاتھ
حالات کے بے رحم تھپیڑوں نے
اس کے ہاتھوں سے جدا کر دیئے تھے......!

اسی طرح انھوں ے عورت کے ہر دکھ کو موضوع بنایا۔ایک نظم ''بانجھ'' میں انھوں نے عورت کی مظلومیت اور معاشرے کی بے حسی کو کچھ اس طرح بیان کیا ہے۔

کتنی بانجھ عورتیں
بچہ نہ ہونے کے جرم میں
گھروں کی چار دیواری سے......
باہر دھکیل دی جاتی ہیں

بچے تو مرد کا نصیب ہیں

مگر یہ بات مردوں کو سمجھ میں کیوں نہیں آتی

شاید سمجھ میں آتی ہوگی

مگر......

جان کر بھی اُنجان بن جاتے ہیں!

عورت کے حوالے سے لکھی گئی بہت سی نظموں کے حوالے دیئے جا سکتے ہیں جن میں انھوں نے عورت کے عورت ہونے پر فخر کا اظہار کیا ہے اور انہی نظموں میں انھوں نے عورت کے بیوی، ماں اور بیٹی کے رشتوں کی تبدیلی اور ہر روپ میں عورت کی ایثار کو موضوع بنایا ہے۔ رضیہ اسماعیل اگر اظہار کردہ موضوعات کو اسی انداز سے رقم کرتی رہیں تو یقیناً عورت کے کردار اور رشتوں سے ان نظموں سے بہتر کرافٹ کی نظمیں سامنے آسکیں گی اور وہ اس حوالے سے اپنی الگ پہچان بنا سکیں گی۔

طارق شاہد

(اسلام آباد)

صاحبِ طرز ادیبہ اور خیال افروز شاعرہ

اس وقت میری میز پر دو کتابیں میرے شوق وجنونِ مطالعہ کے لئے رکھی ہوئی ہیں۔ ایک کتاب ''چاند میں چڑیلیں'' نثری اور دوسری کتاب ''پیپل کی چھاؤں میں'' کی ہے۔ یہ دونوں کتابیں محترمہ رضیہ اسماعیل کی ہیں جو یورپ بالخصوص برطانیہ میں علم وادب کے فروغ کے لئے ایک قابلِ قدر نمایاں کردار ادا کر رہی ہیں۔ یہ دونوں ان کی قلمی بالیدگی اور شائستہ فکری کے فن پارے ہیں۔ دونوں کتابوں کا جمالیاتی حسن وندرت (بیرونی یعنی سر ورق) ان کے صفحات پر بکھرے ہوئے منفرد محاسن کی گواہی دے رہے ہیں۔

میرے لئے یہ فیصلہ کرنا ایک مشکل امر تھا کہ میں پہلے نثر کی کتاب پڑھوں یا شاعری کی۔ کیوں کہ دونوں تصانیف اپنی کشش اور دلکشی کے تناظر میں ایک دوسری پر سبقت کی کوششوں میں منہمک ہوا چاہتی تھیں۔ چناں چہ میں نے تھوڑے تھوڑے وقفوں پر دونوں کتابوں کا مطالعہ ایک ساتھ کر دیا۔ اور میں نے اللہ کا شکر ادا کیا کہ کسی نے مجھ پر یہ ذمہ داری ارزاں نہیں کی تھی کہ میری فکر ونظر میں رضیہ اسماعیل ایک شاعرہ اچھی ہیں یا ایک نثر نگار۔ یہ واقعی اس امر کا تعین کرنا کم از کم مجھ جیسے ایک عام اخباری رپورٹر کے لئے ناممکن ہے کہ موصوفہ مقابلتاً اچھی شاعرہ ہیں یا اچھی نثر نگار۔ میں نے ان کی متذکرہ دونوں کتابوں کو زبان وبیان اور احساسات اور جذبات کی ہمہ ہمی کے حوالے سے بے حد دلآویز اور جادو اثر پایا ہے۔ ایک کہنہ مشق شاعرہ کے طور پر میں ان کی شاعرانہ عظمت کا تو قائل تھا ہی، کہ میں

نے انھیں کئی مشاعروں میں بڑے انہماک سے سنا تھا لیکن اب ان کی نثر نگاری سے آشنائی نے میرے دل میں ان کے مقام و مرتبہ کی کئی قندیلیں روشن کر دی ہیں۔ اور حق بات تو یہ ہے کہ میں نے ان کی دونوں کتابوں کو اپنا بہترین ہمدم پایا ہے۔ اور مجھے ان کے فن تحریر سے بہت کچھ سیکھنے کو ملا ہے۔ ان کی نثری کاوش ''چاند میں چڑیلیں'' کے حوالے سے میں اس کے پیش لفظ میں ان کے اس اعتراف سے کہ انھیں طنز و مزاح کا دعویٰ نہیں ہے، بہت متاثر ہوا۔

اپنی طویل صحافتی زندگی میں آج تک میری نظروں سے ایسی کتاب کبھی نہیں گزری ہے جس میں دیباچہ نویس نے دیانت داری سے کم لیتے ہوئے متعلقہ کتاب کی خامیوں کی دہائی دی ہو۔ بعض سکہ بند قسم کے دیباچہ نویس حضرات تو ایسی کتابوں پر بس داد و تحسین کے ڈونگرے برساتے ہیں جن کی کوئی کل سیدھی نہیں ہوتی۔ دوسری طرف اگر کسی ایسی چیز کو اچھا نہ کہا جائے تو یہ بھی بد دیانتی کے زمرے میں آتا ہے۔ میں کوئی نقاد ہوں اور نہ ہی ادیب اور شاعر۔ میری رائے سے کسی کا متفق ہونا ضروری نہیں۔ تاہم میری رائے میں رضیہ اسماعیل کا قلمی حدود اربعہ ہمارے ادبی ارتقاء کا ایک مستند شاہکار ہے۔ اور خاص طور پر ان کے رنگ رنگ کے ماہیے، جن میں طنز و مزاح سے لے کر حمدیہ اور نعتیہ ماہیے شامل ہیں، ان سے میں بہت متاثر ہوا ہوں۔

کئی سال پہلے میں نے حکومتِ پاکستان کے ادارہ مرکزی اردو ربورڈ کے لئے برطانیہ میں اردو صحافت کے موضوع پر ایک تاریخی پس منظر کی حامل کتاب لکھی تھی۔ میری اس حقیر کاوش کے ناشر، اللہ مغفرت کرے، اشفاق احمد خان تھے۔ نہ جانے پنجاب یونیورسٹی لاہور کے اربابِ بست و کشاد کو اس میں کون سی خوبی نظر آئی کہ انھوں نے صحافت کے طلباء کے لئے اسے بطور ''کتابِ حوالہ'' منظور کر لیا۔ اس کتاب میں اس دور کے حالات اور رجحانات کی روشنی میں میں نے پیش گوئی کی تھی کہ برطانیہ میں اُردو زبان کے سب دیئے

آئندہ پندرہ سالوں تک بجھ جائیں گے۔ جب میں نے یہ دعویٰ کیا تھا تو میرے وہم وگمان میں بھی نہ تھا کہ رضیہ اسماعیل جیسی صاحبِ طرز ادیبہ اور خیال افروز شاعرہ بھی برطانیہ پہنچ کر اپنی شمعِ اُردو کو روشن کر کے میری اس رائے پر خطِ تنسیخ کھینچ کر رکھ دیں گی۔ مجھے خوشی ہے کہ میری وہ پیش گوئی حرفِ غلط ثابت ہوئی اور برطانیہ میں اُردو زبان کی مقبولیت اور عوامی چاہت میں مسلسل اضافہ ہو رہا ہے۔ اور اس کا یہ کریڈٹ لامحالہ رضیہ اسماعیل اور ان جیسی دیگر قلم کار خواتین کو جاتا ہے۔

سلطان محمود
برمنگھم
(یو-کے بیورو چیف
روزنامہ ''نوائے وقت'' پاکستان
روزنامہ ''دی نیشن'' پاکستان)

عورت کہانی

مدتوں یا زمانوں کی بات نہیں۔ یہ گزرتے ہوئے ہزارویں سال کی چوکھٹ سے جڑی اٹھارویں اور انیسویں صدی کا المیہ ہے، جہاں مشرق کی بات تو مشرق ہی جانے، مغرب کی عورت بھی احساس اور ذہن سے عاری صرف ایک جسم سمجھی جاتی تھی۔ ایسا جسم جس کا مصرف مرد کے فطری تقاضوں کی تسکین، اس کی نسل کی بڑھوتی، اس کی ناز برداری یا اس کے گھر کا باورچی خانہ سنبھالنے کے سوا کچھ نہیں تھا۔

ایک مخصوص سماجی اور معاشرتی حاکمانہ نظام میں عورت کے تجربے اور ویژن کو چار دیواری میں محدود رکھ کر نہ صرف اس کا جسمانی بلکہ ذہنی استحصال بھی کیا جاتا رہا۔ یہی نہیں بلکہ اپنے ہی طور پر یہ بھی طے کرلیا گیا کہ اول تو وہ سوجھ بوجھ نہیں رکھتی، اور بالفرض اگر رکھتی بھی ہے تو مرد کی سطح پر نہیں۔ اس کی ذہانت مردوں کے مقابلے میں خود بخود دوسرے درجے کی گھٹیا اور کم معیاری تسلیم کرلی گئی۔

اپنے اس خود ساختہ فیصلے کو درست ثابت کرنے کے لئے اس نے عورت کو علم و ادب اور فنونِ لطیفہ کے ہر میدان سے دور رکھنے کی کوشش کرتے ہوئے اسے کولہو کے بیل کی طرح اپنے احکامات کے گرد گھومنے پر مجبور کیے رکھا۔ شعری تخلیق، نقد و نظر، افسانہ، ناول ڈراما، مصوری، مجسمہ سازی، طب، فلسفہ، سیاست یا معاشیات ہر وہ شعبۂ زندگی، جس کے ذریعے عورت کی زندگی میں تازہ ہوا کا کوئی روزن کھلنے کا امکان تھا، اس پر اسکے دروازے بند

رہے۔ اس کا نہ صرف ذہن بلکہ احساس تک پہروں میں گھونٹ کر رکھا گیا۔ وہ اپنی ذات کے حوالے سے کیا سوچتی ہے، اس کا اظہار بالکل اسی طرح معیوب سمجھا جاتا رہا جیسا کہ تیسری دنیا خصوصاً برصغیر پاک وہند کی ایک بڑی تعداد آج بھی سمجھتی ہے۔

صدیوں تک عورت کے فن پارے منہ بند تجوریوں کی طرح زبان بندی کے قفل میں رکھے رہے۔ وہ اندر ہی اندر شعر تراشتی، کہانیاں لکھتی، تصویریں بناتی رہی مگر آنچل میں بندھی گرہ کھولنے کی اجازت نہ ملنے کے انتظار میں نہ جانے کیا کچھ اس کے ندر ہی تلف ہو گیا۔ اور اجازت اس لئے نہ مل سکی کہ اس کے اندر چھپے خزانے نظروں میں آ کر اس کی فکر کو اعتبار نہ دے دیں۔

مغربی ادب میں مردوں کی اس اجارہ داری کا دائرہ توڑ کر اندر قدم رکھنے والی جن خواتین نے ہراول دستے کا کام انجام دیا، ان میں ایملی ڈکسن، جین آسٹن، گلیمن اور ورجینا وولف وغیرہ کے نام سرِ فہرست ہیں۔ ان میں سے کچھ کا کام زندگی میں اور کچھ کا مرنے کے بعد تسلیم کیا گیا۔

جذبات واحساسات کی ترجمانی کے لئے صنفِ شعر دنیا بھر میں سب سے زیادہ مؤثر ذریعۂ اظہار سمجھا جاتا ہے۔ سمندر کو قطرے میں سمو دینے کا کمال رکھنے والی یہ صنفِ سخن پوری دنیا میں یکساں مقبول ہے۔ اس ضمن میں اُردو شعر وادب کے حوالے سے اُردو شاعری کی روایت میں گزشتہ پانچ دہائیوں سے عورتوں کا جو حصہ یعنی (کنٹری بیوشن) ہے، اس نے شاعری کو نئے لہجوں، نئے آہنگ سے روشناس کرایا ہے۔ انھوں نے اپنے ذاتی اور کائناتی جذبات واحساسات کے انعکاس کے لئے غزل، پابند نظم اور آزاد نظم کے علاوہ نثری نظم کو بھی اظہار کا ذریعہ بنایا ہے۔ گو کہ نثری نظم کی روایت چند ناموں سے شروع ہو کر چند ناموں تک ہی محدود دکھائی دیتی ہے لیکن عورت کے تعلق سے کشور ناہید نے نثری نظم کو جو اثاثہ دیا ہے، وہ دیر تک اور دُور تک باقی رہنے والا ہے۔

رضیہ اسماعیل کی زیرِ نظر کتاب ''میں عورت ہوں'I am a woman'' میں عورت کے حوالے سے جو نظمیں شامل ہیں وہ ہمارے سماجی ڈھانچے میں اس کی ذات کے ارتقائی پس منظر کی عکاس ہیں۔ ان کی نظموں میں اس کی سوچ، اس کے دکھ، پل پل جینے مرنے کی اذیت، تکالیف و مسائل اور آرزوؤں، تمناؤں کے درد کی مار کھائے کاسنی پھولوں کی بہار ہے۔

رضیہ کی نظموں کی عورت کشور ناہید کی نظموں کی عورت سے مختلف نہیں۔ دونوں ہی کے یہاں بنتِ حوا کے ساتھ صدیوں سے چلے آتے ناروا سلوک پر احتجاج اور شناخت کا مطالبہ ہے۔ اپنی پہچان، اپنی عزت اور توقیر کی مانگ ہے۔ لیکن کشور ناہید کی نظمیں ایک سانسیں روک دینے والا منظر نامہ ہیں جن میں روح کے تار جھنجوڑ دینے کی شدت ہے۔ جب کہ رضیہ اسماعیل دھیمے لہجے کے پیراہن میں لپٹی ہوئی ہیں۔ ان نظموں میں عورت کی داخلی کیفیات کے علاوہ اندر سر اٹھانے والے سوالوں کی گونج بھی ہے۔ ماں، بیٹی، بیوی اور بہن کے رشتوں سے ہٹ کر بحیثیت ایک فرد، ایک انسان وہ کیا ہے؟ کون ہے؟ اس کی اپنی ذات کہاں ہے؟ ''میرا حوالہ'' ہر عورت کے اندر شور مچانے والے انہی سوالوں کا جواب ہے۔

مردوں کے معاشرتی نظام میں وہ خود ہر تعزیر، ہر پکڑ سے آزاد ہیں لیکن عورت کے تمام گناہ و ثواب کے باز پُرس کے حق دار ہیں۔ یہاں تک کہ وہ غلطی جس میں دونوں برابر کے شریک ہوں، اس کی خطا کی سزا بھی اکیلی عورت کے نام لکھی جاتی ہے۔ رضیہ نے اپنی نظم ''عورت کا گناہ'' اس بے انصاف روش کی تصویر ہے۔

میرے گناہ کی عمر
کیوں اتنی طویل ہے!
میرے شریکِ گناہ نے

پیار کے نام پر......

میری عصمت کی چادر تار تار کی

کبھی نہ آنے والے کل کی امید پر

ایک گھر کے سپنے دکھا کر

امیدوں کے گلشن کو خاکستر کیا

وہ تو اپنا کام کر کے چلا گیا

مگر میرا گناہ...... میرے پیٹ میں

آلتی پالتی مار کر کیوں بیٹھ گیا ہے

میری کوکھ میں سڑاند کیوں

میں ماں تو بننا چاہتی تھی

مگر......

اب میرا ماں بننا باعثِ عبرت ہے

میں ننگِ خاندان، حوّا کی بیٹی

سنگسار کیے جانے کے لائق

مگر......

اس گناہ کی سزا صرف مجھے کیوں

اسے کیوں نہیں

صرف اس لئے کہ

میرا گناہ ظاہر ہے

اور اس کا پوشیدہ..... !

اس کا گناہ رات کی تاریکی میں تحلیل ہو گیا

اور میرا گناہ .....

دن کے اُجالے میں ظاہر ہو گیا!

رضیہ اسماعیل کی نظموں میں روز جی کر مرنے سپنے بُن کر ادھیڑنے، خواب چُن کر بکھیرنے والی اور انتظار کے کرب سے گزرنے والی صرف مظلوم، کمزور اور ناتواں عورت ہی نہیں بلکہ اس میں اپنی قوت کا احساس موجود ہے۔ ''مدر ٹریسا'' جان لیوا انتظار کے ساتھ ساتھ عورت کی قوت کے اظہار کا مظہر ہے۔ گزرتے ہوئے وقت کے سفر میں علم و فضل نے اسے ناانصافی، ظلم اور جبر کی ان شکلوں سے واقف کر دیا ہے جنھیں نام دے کر نشان دہی پر وہ پہلے قادر نہیں تھی۔ یہی وہ خوف تھا جس سے ڈر کر مردوں نے اس پر لفظوں کی سمت جانے والے رستے میں کانٹے بو رکھے تھے۔

رضیہ کی نظموں میں عورت کے کرب، احتجاج اور پیاس کے علاوہ اس کا اپنے وجود کی سمت احساسِ آگہی بھی ہے اور میں سمجھتی ہوں کہ یہ احساسِ آگہی ہی عورت کی حق رسی کا سب سے اہم موڑ ہے۔

شاہدہ احمد

(لندن)

مارچ ۲۰۰۰ء

حرمتِ قلم کی امین

رضیہ اسماعیل کی شاعری انسانی زندگی کے اُس نصف کے متعلق ہے جسے علامہ اقبال نے ''تصویرِ کائنات'' کا رنگ کہا ہے۔انھوں نے معاشرے میں عورت کے سماجی آشوب کا نہایت دردمندانہ نقشہ کھینچا ہے۔عورت کو عورت ہونے کا وقار بخشا ہے۔عورت کے جذبات کی ترجمانی کرتے ہوئے احساس و تجربات اور مشاہدات کی مختلف سطحوں کو نہایت خوب صورتی سے چھوا ہے۔عورت کے احساسِ محرومی اور بے بسی کا حقیقی تجربہ اور مشاہدہ ان کی کتابوں ''میں عورت ہوں'' اور ''سب آنکھیں میری آنکھیں ہیں'' میں جلوہ گر ہوتا ہے۔

خواتین کی آزادئ فکر و عمل کو جاوداں بنانے،ظلم و استبداد اور حق و انصاف کے درمیان تقابل اور تضادات کے ذریعے انھوں نے سنجیدہ معاشرتی حقائق کی گرہ کشائی کی ہے۔ان کے تصورات، ان کی تہذیب کی کوکھ سے جنم لیتے ہیں جو ہم سب کے لئے ایک لمحۂ فکریہ ہیں۔وہ پوچھتی ہیں کہ:

سوچ کے بادباں
اس ہوا، اس فضا میں کھلیں بھی تو کیسے کھلیں
مجھ کو تو ہی بتا، مجھ کو تو ہی بتا

ان کے نزدیک الفاظ صحرانوردی تو کرتے ہیں مگر یہ انھیں آوارگی کی اجازت نہیں دیتیں۔شاید ان کے نزدیک حرف مقصدیت کے بغیر زندگی کا پیامبر نہیں ہوسکتا۔وہ جانتی

ہیں کہ رعنائیِ گلشن، شاخ تراشی اور دریا کی روانی کناروں کی دسترس میں ہوتی ہے۔ لکھتی ہیں کہ:

لکھو، اتنا لکھو

یہ زندگی تحریر بن جائے

کسی کاغذ کے ٹکڑے پر

کوئی بگڑی ہوئی تقدیر بن جائے

شاعری ہمیشہ دو رویوں کے درمیان سفر کرتی ہے۔ کبھی مشاہدات اس کو اپنے حصار میں لیتے ہیں تو کبھی خواہشات اسے اپنی باہوں میں سمیٹ لیتی ہیں۔ ان کے ہاں دونوں ہی رنگ موجود ہیں۔ کبھی پتھر سے سطحِ آب پر ارتعاش پیدا کرتے ہیں تو کبھی دائرے بنتے اور مٹتے ہیں تو کہیں محبتوں اور عقیدتوں کے گلابوں کی مہک ہے۔ مثلاً

اشکوں سے وضو کر کے

ماہیے لکھتی ہوں

میں دل کو لہو کر کے

زنجیر ہے پاؤں میں

دنیا دیکھ چکی

چل واپس گاؤں میں

ان کے اشعار میں احتجاج کی کیفیت نظر آتی ہے۔ ان کی شاعری ہمارے معاشرتی رویوں کے خلاف ایک تازیانے کی حیثیت رکھتی ہے۔ انھوں نے سوچوں کے سفیروں کو روایتوں کا محتاج کرنے کی بجائے طغیانیوں سے ٹکرانے کا حوصلہ دیا ہے۔ صاحب دستار کی سازش، بے سروں کی مجبوریاں، برگِ گل کا جمال، گلشن کا ملال، زرد چہروں پر سسکتی

مسکانیں، وقت کے ہاتھوں میں پکڑی ہوئی ظالم کمانیں، ہونٹوں پر جاگتی پیاس، آنکھوں میں دم توڑتی ہوئی آس سب ان کی شاعری کا حصہ ہیں۔ مثلاً:

میں ظلم کو ظلم ہی کہوں گی، میں رات کو رات ہی کہوں گی

میں ریت کو لہر کیسے کہہ دوں، ندی کو کیسے سراب لکھوں

رضیہ اسماعیل ایک ہمہ جہت شخصیت ہیں۔ ماہرِ تعلیم، ادیبہ، شاعرہ، مزاح نگار سماجی کارکن، حقوقِ نسواں کی علم بردار، حرمتِ قلم کی امین، دید سے دیدہ ور تک وہ کسی سے منافقت نہیں کرتیں۔ ان کے پاس طنز کا نشتر بھی ہے۔ ظرافت کا وٹامن بھی ہے۔ مزاح کا اینستھیزیا بھی۔ جرأتِ اظہار، حریتِ فکر کو روبہ عمل لاتے ہوئے وہ کہہ رہی ہیں کہ زندگی کی اجتماعی جدوجہد میں عورت کا کردار تسلیم کیا جائے۔ اس طرح معاشرہ وسعتِ نظر اور فکر و خیال کی ایسی ہمہ گیر صفت سے آشنا ہوگا جو قومی اور ملی فکر و وحدت کے لئے ناگزیر ہے۔ اس لئے ہم سب کو رضیہ اسماعیل کی آواز سے آواز ملا کر کہنا ہوگا کہ آؤ ہم مل کے زمانے کو بتا دیں کہ وہ عورت جسے تم نے تصویر کہا، محض تصویر نہیں، منبعِ تنویر بھی ہے۔ وہ فقط خواب نہیں، خواب کی تعبیر بھی ہے۔ صرف توقیر نہیں، باعثِ توقیر بھی ہے۔

فرخ زہرا گیلانی

(لاہور)

رضیہ اسماعیل کے کئی روپ

رضیہ اسماعیل کو میں ایک سوشل ورکر اور پھر حقوقِ نسواں کی جنگ لڑنے والی ایک سپہ سالار کی حیثیت سے جانتا تھا۔ جنھوں نے خواتین کے لئے ۱۹۹۷ء میں ''آ گہی'' نامی ایک تنظیم قائم کی۔ رضیہ اسماعیل نے قلیل وقت اور محدود وسائل کے باوجود برطانیہ بھر کی اہلِ قلم خواتین کو ایک گلدستہ میں کچھ اس طرح سجایا کہ ایک ''وومن ڈائریکٹری'' مرتب کرتے ہوئے خواتین کا مختصر تعارف، ادبی کاوشوں اور رابطے کے فون نمبر اور پتے اس میں شامل کر دیئے۔ اس ڈائریکٹری نے برطانیہ بھر کی اُردو کی اہلِ قلم خواتین کو ایک دوسرے کے قریب کرنے میں اہم کردار ادا کیا۔

رضیہ اسماعیل نے ڈائریکٹری کے ساتھ ساتھ برطانیہ کے سکولوں میں زیرِ تعلیم طالبات کے لئے ورکشاپس کا بندوبست کیا۔ ان ورکشاپس میں نامور شاعروں کو مدعو کیا جاتا رہا جو بچیوں کو شاعری کے اسرار ورموز سے آگاہ کرتے ہوئے انھیں ادب تخلیق کرنے کے گُر سکھاتے رہے۔ پھر جوان خواتین کے تخلیقی کام کو جمع کر کے اُسے کتابی شکل میں شائع کروایا۔ رضیہ اسماعیل نئے دور کے تقاضوں کو پورا کرنے اور انھیں اپنانے کی بھرپور کوشش کرتی ہیں۔ نئے دور کی اہم ضرورت کمپیوٹر اور ویب سائٹ ہے۔ رضیہ اسماعیل نے www.aaghee.co.uk کے نام سے ایک ویب سائٹ بھی تیار کروائی ہے جس میں چالیس خواتین کی شاعری کو شامل کیا گیا ہے۔

دوسروں کے لئے کام کرنے والی رضیہ اسماعیل غمِ روزگار کے ساتھ ساتھ شاعری اور نثر نگاری کا نہ صرف غم پالتی ہیں بلکہ اب تک ان کی چھ کتابیں بھی شائع ہو چکی ہیں۔ شاعری کی کتابوں کے ساتھ ساتھ طنز و مزاح کی ایک نثری کتاب ''چاند میں چڑیلیں'' بھی شائع ہوئی ہے۔

اگر میں نے بچپن میں دادی اماں کی کہانیاں نہ سنی ہوتیں تو یقیناً کتاب کا ٹائٹل دیکھ کر مجھے حیرت ہوتی۔ دادی اماں کی کہانیوں میں چڑیلوں کا اکثر ذکر ہوتا تھا جنھیں سن کر ذہن میں جو تصور پیدا ہوتا تھا اس کے مطابق چڑیلیں بدشکل عورتوں کا دوسرا روپ ہوتی ہیں جو ویرانوں میں رہتی ہیں اور موقع ملتے ہی خوب صورت مردوں کا جگر نکال کر مزے لے لے کر کھا جاتی ہیں۔ بچپن کی یادوں کو ذہن میں لاتے ہوئے قریب تھا کہ میں رضیہ اسماعیل سے اس بات پر اختلاف کرتا کہ شاعروں کے تصوراتی چاند میں بھلا چڑیلیں کہاں؟ لیکن بھلا ہو امریکی سائنس دانوں کا، جنھوں نے تحقیق کے بعد ثابت کیا ہے کہ چاند اتنا خوب صورت نہیں جتنا اُردو کے شعرا نے اُسے خوب صورت پیش کیا ہے، بلکہ چاند تو ویران اور سنسان ہے۔ یہ سوچتے ہوئے رضیہ اسماعیل کی کتاب کو اس نیت سے پڑھنا شروع کیا کہ چاند کے ویرانے میں چلو میں بھی چڑیلیں ڈھونڈوں اور یہ معلوم کرنے کی کوشش کروں کہ واقعی چڑیلیں زمین سے چاند پر منتقل ہو چکی ہیں۔ لیکن جب کتاب کو پڑھنا شروع کیا تو اُس میں چڑیلوں کی بجائے مجھے ہلکے پھلکے انداز میں لکھے گئے مضامین پڑھنے کو ملے جنھیں میں مزے لے لے کر پڑھتا اور مسکراتا رہا، کیوں کہ مضامین میں طنز بھی ہے اور مزاح بھی۔ میرے خیال میں رضیہ اسماعیل نے کتاب کے آغاز میں یہ بات لکھ کر کسرِ نفسی برتی ہے کہ ''مزاح نگاری کا مجھے دعویٰ نہیں اور طنز میرے مزاج کا حصہ نہیں ہے۔'' لیکن اس انکار کے باوجود انھوں نے بڑی خوب صورتی سے کتاب میں طنز و مزاح دونوں پیدا کیے۔ رضیہ اسماعیل کتاب میں لکھتی ہیں کہ:

''اپنی اس قدر صحت مند نانی کو دیکھ کر ہمیں دوسروں کی مریل قسم کی نانیاں بہت اچھی لگتیں۔ بچپن کی بہت سی خواہشات میں سے ہماری ایک خواہش یہ بھی رہی کہ کاش اللہ میاں ہمیں بھی ایک لرزتی کانپتی ہوئی نانی عطا کرتے، جس کی موتیا بھری آنکھوں پر دبیز شیشوں کی عینک ہوتی۔ ہزار کوشش کے باوجود نانی اپنی آنکھ سے آگے نہ دیکھ سکتیں، مصنوعی دانت ہوتے جو نانی نہ تو ہمیں دکھا سکتیں اور نہ ان سے کھا سکتیں۔''

رضیہ اسماعیل نے شاعری، نثر نگاری اور خواتین کی سپہ سالاری کے ساتھ ساتھ اپنے گلشن، اپنے گھر کو بھی معطر کیا ہوا ہے۔ اور گھر میں ایک ایسا ماحول پیدا کیا جس کے آنگن میں بیٹھ کر انھیں ''چاند میں چڑیلیں'' بھی نظر آتی ہیں اور آنگن میں کھلے پھول بھی۔

میں تو اس بات سے اتفاق کرتا ہوں کہ اپنے لئے تو ہر کوئی کام کرتا ہے، دوسروں کے لئے کام کرنے والے لوگ عظیم ہوتے ہیں۔ رضیہ اسماعیل بھی اپنی ذات کی بجائے دوسروں کے کام کرتی ہیں اور بلاشبہ ایک عظیم خاتون ہیں۔ برطانیہ میں جب بھی مورخ اُردو ادب کی تاریخ لکھے گا تو رضیہ اسماعیل، جو اَب ڈاکٹر رضیہ اسماعیل ہیں، کے کام سے چشم پوشی کی گئی تو وہ تاریخ ادھوری ہی رہے گی۔

یعقوب نظامی

(بریڈفورڈ)

درویشنی

راجی، راج اور رجّو، یہ سب رضیہ کے بچپن کے پیار کے نام ہیں مگر ہمارے بابا اسے پیار سے "راج دُلاری" کہہ کر بلایا کرتے تھے۔ وہ بابا کی بہت ہی لاڈلی اور منہ چڑھی بیٹی تھی اور کسی کو کم ہی خاطر میں لاتی تھی۔ بس اپنی ہی دنیا میں مگن، اپنی ہی مستی میں سرشار۔ بڑی سنجیدگی اور متانت سے نہایت انہماک کے ساتھ اپنے چھوٹے چھوٹے کاموں میں مصروف رہتی۔ نہ وہ خود کسی کے راستے میں آتی اور نہ ہی کسی دوسرے کی بے جا مداخلت پسند کرتی تھی۔ صاف گوئی، لگی لپٹی رکھے بغیر ہی بات کہہ دیتی۔ اگرچہ بڑی ہو کر اس کی صاف گوئی، سادگی اور سچائی نے اسے نقصان بھی پہنچایا۔ خود غرضی، منافقت اور ریاکاری سے بنی ہوئی اس دنیا میں مجھے وہ کسی اور ہی دنیا کی مخلوق لگتی۔ کبھی کبھی تو مجھے ایسا لگتا جیسے وہ اپنے وقت سے بہت پہلے پیدا ہو گئی ہے کہ ابھی یہ دنیا اس جیسے سچے اور بے ریا لوگوں کے لئے موزوں نہیں ہے۔ یا پھر اسے بہت پہلے پیدا ہونا چاہیے تھا۔

ہم تین بہنوں میں وہ سب سے چھوٹی تھی مگر متانت اور بردباری میں وہ سب سے بڑی نظر آتی۔ رضیہ کے بعد پانچ بھائی پیدا ہوئے جس سے رضیہ کی ناز برداریاں اور بھی بڑھ گئیں کہ یہ بھائیوں کا بقول بابا "بازو پکڑ کر لاتی ہے"۔ گویا بچپن سے ہی اسے ایک منفرد حیثیت حاصل تھی۔ اور بعد میں بھی زندگی کے ہر میدان میں اس نے اپنی یہ انفرادیت برقرار رکھی۔ بابا اسے ہمیشہ بیٹا کہہ کر بلاتے تھے اور اس نے بھی صحیح معنوں میں بابا کا بیٹا بن

کر ہی دکھایا۔ رضیہ نے بچپن میں زیادہ تر لڑکوں والے کھیل ہی کھیلے۔ عام لڑکیوں جیسے شوق اس نے کبھی نہیں پالے۔ نہ مہندی، نہ چوڑیاں، نہ اپنے کپڑوں کے لئے ضد، نہ ہنڈ کلیا، نہ گڑیوں کے شادی بیاہ، نہ کسی کی سُن گُن، نہ ادھر کی باتیں ادھر، نہ بے جا شیخیاں، نہ شوخیاں، نہ شراتیں۔ بڑی دیر تک تو اس کا مزاج ہماری سمجھ میں ہی نہیں آیا کہ یہ لڑکی کس مٹی کی بنی ہے اور کیا چیز ہے؟ کھیتوں کھلیانوں میں گھومنا، درختوں پر چڑھنا، جانوروں سے پیار کرنا، کتابیں پڑھنا اس کے محبوب مشغلے تھے۔ نہایت ذہین تھی۔ سب سبق ازبر، اساتذہ کی آنکھ کا تارا۔ ہر امتحان امتیازی نمبروں کے ساتھ پاس کیا مگر سادگی اور بے نیازی کا یہ عالم کہ کبھی اس کا ڈھنڈورا نہیں پیٹا۔ منافقت، ریاکاری اور سطحی باتوں سے کوسوں دور بھاگتی ہے۔ کسرِ نفسی بہت ہے۔ ایک عجیب سی درویشی اور مجذوبانہ پن ہے اس کے اندر۔ اسے اپنی تنہائی بہت عزیز ہے۔ ذہین اور بلند کردار اور سچے لوگوں کی دل سے قدر کرتی ہے۔ دل اور ہاتھ دونوں سے سخی ہے۔ دامے، درمے، سخنے ہر ضرورت مند کی مالی اور اخلاقی مدد کرنا اپنا فرض سمجھتی ہے۔ بنیادی طور پر انسان کی عزت کی قائل ہے۔ ہر شخص کی عزت کرتی ہے اور چاہتی ہے کہ دوسرے اس کی عزت کریں۔ اس کے بے تکلف دوستوں کی تعداد بہت کم ہے۔ ہر ایک سے ''آپ'' سے ہی مخاطب ہوتی ہے۔ صرف بے تکلف دوستوں اور بہنوں کے ساتھ ''تم'' کا صیغہ استعمال کرتی ہے۔ نہایت حسّاس اور نرم دل ہے۔ لوگوں کے منفی رویوں پر بہت جلد رنجیدہ ہو جاتی ہے اس لئے لوگوں سے کم سے کم ملتی ہے تاکہ بعد میں کبیدہ خاطر نہ ہو۔ جہاں کہیں منافقت کی بو پاتی ہے تو کسی سے کچھ کہنے کی بجائے خاموشی سے راستہ ہی بدل لیتی ہے۔ میری یہ اصولوں والی بہن، ایک اچھی منتظمہ، بہترین خاتونِ خانہ، نہایت پیار کرنے والی ماں، پُرخلوص شریکِ زندگی، جان چھڑکنے والی بہن اور قابلِ فخر بیٹی ہے۔ اپنے لفظوں کی حرمت کی امین، وقت کی پابند۔ جس کے ساتھ کمٹمنٹ کرتی ہے، اسے دل و جان سے نبھاتی ہے۔ حسّاس اس قدر کہ بچپن میں اس نے بلی پال رکھی تھی جو

اچانک داغِ مفارقت دے گئی تو اسنے کئی روز تک اس کا سوگ منایا۔ باقاعدہ بلی کی قبر کھود کر اسے دفن کیا اور اس کے بعد آج تک کوئی پالتو جانور نہیں رکھا۔ شاید رضیہ کے دل میں بچپن میں بننے والی ننھی سے قبر نے اسے خوف زدہ کر دیا تھا۔

بابا جب ولایت آئے تو یہ کوئی دس گیارہ برس کی رہی ہوگی۔ جدائی کے اس غم کو رضیہ نے روح میں اتار لیا۔ جوانی میں بہت ڈسٹرب اور مضطرب رہی اور شاید آج بھی کھوئی ہوئی پاکیزہ محبت کی تلاش میں رہتی ہے۔ بابا سے چھوٹی سی عمر میں جدائی نے رضیہ کی ننھی سی دنیا کو تہہ و بالا کر دیا جس کا اندازہ کسی کو ٹھیک سے اُس وقت نہ ہو سکا اور شاید خود رضیہ بھی صحیح طرح اپنے آپ کو نہ اُس وقت جان سکی۔ بس اپنے اندر ہی کنڈلی سی مار کر بیٹھ گئی۔ اس لئے رضیہ کو سمجھنا، اس کے قریب جانا اتنا آسان نہ تھا۔ بس اندر ہی اندر غموں کی پرورش کرتی رہی۔ شاید یہیں کہیں اس کے اندر کی غم زدہ لڑکی نے ہاتھ میں قلم پکڑ کر ہوا پر لکیریں کھینچنا شروع کر دی تھیں۔ مجھے اندازہ بھی نہ تھا کہ میری یہ گم سم سی رہنے والی بہن ایک دن اپنے خونِ دل سے کاغذ کا سینہ لہولہان کر کے رکھ دے گی۔ لکھنا رضیہ کی مجبوری ہے، اس کا کتھارسس ہے، اپنے خیالات و جذبات کا اظہار نہ کرے تو شاید اس کے اندر کی گھٹن اسے ایک قدم نہ چلنے دے۔ کیوں کہ رضیہ ایک ساکت و جامد نہیں بلکہ ایک متحرک شخصیت کا نام ہے۔

میں نہ کوئی شاعرہ ہوں، نہ ادیبہ اور نہ نقاد۔ مگر ایک بات پورے وثوق سے کہہ سکتی ہوں کہ رضیہ کی تحریریں اس کے جذبے، احساس، تجربے اور مشاہدے کی بھٹی میں پل کر جوان ہوتی ہیں۔ اُس نے زندگی کو برتا ہے۔ سنی سنائی کہانیاں قلم زد نہیں کیں۔ غموں کی آگ نے اسے جلایا نہیں بلکہ مزید سنوارا اور نکھارا ہے۔ مگر افسوس صرف اس بات کا ہے کہ رضیہ نے بہت دیر سے لکھنا شروع کیا۔ اس نے اپنی صلاحیت سے بہت کم لکھا ہے۔ اگر اسے موافق حالات ملے ہوتے تو اس کی پرواز کسی اور آسمان تلے ہوتی۔ رضیہ بنیادی طور پر اپنے ہی لئے لکھتی ہے۔ نہ چھپنے چھپوانے کا اہتمام کرتی ہے اور نہ پی آر اور پروموشن کے

لئے فکر مند ہوتی ہے۔ بس خاموشی سے اپنا کام کیے جاتی ہے۔ گویا ''نہ ستائش کی تمنا نہ صلے کی پروا''۔ بس اپنے مالکِ حقیقی سے خاص رابطہ رکھتی ہے۔

انسانی خدمت کو سب سے بڑی عبادت گردانتی ہے۔ اپنے خالق و مالک سے قائم پاکیزہ تعلق کو وہ کسی بھی قیمت پر آلودہ نہیں کرتی۔ روشن آنکھوں والی رضیہ کے اندر کی دنیا اس سے کہیں روشن ہے۔ یہ سب خدائے بزرگ و برتر کا انعام ہے۔ اس کا خاص کرم ہے میری بہن پر۔ جس کے لئے وہ خالقِ حقیقی کی بے حد شکر گزار ہے۔

رضیہ کو پلیٹ میں سجی سجائی زندگی نہیں ملی۔ اس کے لئے اس نے بہت محنت کی ہے۔ کتنی تاریک راتوں اور کتنی بے نور صبحوں سے آشنا ہو کر روشنیوں میں آئی ہے۔ اس کے سب محاذ زندہ ہیں۔ گویا اس نے زندگی نہیں گزاری چومکھی لڑائی لڑی ہے اور اب تک لڑ رہی ہے۔ اور یقیناً آخری فتح بھی حق اور سچائی ہی کی ہو گی۔ رضیہ ایک گوہرِ نایاب ہے اور مجھے رضیہ کی بہن ہونے پر فخر ہے۔ رضیہ کی ناقدری کرنے والے لوگوں نے رضیہ کا کچھ نہیں بگاڑا بلکہ اپنا ہی نقصان کیا ہے۔ کیوں کہ وہ ایک نایاب انسان کی دوستی اور محبت سے محروم رہ گئے ہیں۔ رضیہ ایک شعر اکثر دہراتی رہتی ہے:

ہم فلک کے آدمی تھے ، ساکنانِ قریۂ ماہتاب تھے
ہم ترے ہاتھوں میں کیسے آ گئے ، ہم تو بڑے نایاب تھے

عصمت بانو
(برمنگھم، برطانیہ)

بحرِ بیکراں
(ایک کھلا خط)

برمنگھم کے بحرِ نسواں کے سکوت میں علم و آگہی کی ایک باغی لہر نے ایک عرصے سے ہل چل مچا رکھی ہے۔ اگرچہ اس باغی لہر کے بہاؤ کو روکنے کے لئے تمام رائج الوقت حربے استعمال ہوتے رہے ہوں گے مگر ہوا، پانی، مہک اور علم ہمیشہ سرحدوں کی گرفت کو توڑتا رہا۔ اسی لئے یہ خودسر آگہی کی لہر برمنگھم کی سرحدوں کو زیر کرنے کے بعد قومی دھارے کی جانب محوِ سفر ہے۔ بظاہر تو یہ ایک کمزور و بے زبان، حساس و باوقار سی لہر دکھائی دی جاتی ہے مگر اپنے اندر ایک طوفان چھپا رکھنے کا کمال بھی رکھتی ہے۔ اس نے گونگی اور بہری نسوانیت کو زبان اور پہچان دینے کا جو بیڑا اٹھا رکھا ہے، آج ایک سیلاب کی صورت اختیار کرنا چاہ رہا ہے۔ اس میں چھوٹے چھوٹے ندی نالے بھی اپنی بقا کے لئے شامل ہو رہے ہیں۔ سال ہا سال اس پھول کو گملے کی زینت بننے پر مجبور کیے رکھا گیا۔ جوں ہی اس کے پاؤں کے نیچے لامحدود خطۂ زمین آیا، تو بقول شاعر

قفس میں میری طاقتِ پرواز نہ پوچھ
کھلا آسماں جو ملتا تو امتحان ہوتا

آگہی کے پودے کو گملے سے رہائی پائے کوئی عرصہ نہیں ہوا کہ یہ قد آور درخت بن کر اپنی حیثیت تسلیم کروا چکا ہے۔ وہ کتنے خوش نصیب لوگ ہیں جو اس کاروانِ آگہی میں شامل

ہیں۔مؤرخ آ گہی کو یقیناً تاریخ کے صفحات کی آغوش میں ایک جائز مقام بخشے گا اور میرِ کارواں کے پرستاروں، خدمت گزاروں یا حاشیہ برداروں میں اگر نام چھپ جائے تو خوش نصیبی کی انتہا نہ ہوگی۔حضرت یوسف علیہ السلام کے خریداروں میں اگر ایک طرف عزیزِ مصر کا نام آتا ہے تو دوسری طرف غریب بڑھیا (اور اس کی سوت کی اٹی) کا ذکر بھی آتا ہے بلکہ بڑھیا نے کبھی سوچا بھی نہ ہوگا کہ تاریخ اسے امر کردے گی۔

آپ نہ صرف میرِ کارواں ہیں بلکہ ماہر سنگ تراش وتزئین کار بھی ہیں۔آپ نے اپنی قسمت کے ابنِ آدم کو دوبارہ تراشا اور اس کی ذہنی اور علمی تزئین و آرائش کر کے انمول کر دیا۔شاید ہر بنتِ حوا اپنے ابنِ آدم کو نکھارنے کی ازلی خواہش مند ہوتی ہے مگر ناشکرا ابنِ آدم اپنی انا کی بقا کے لئے اپنی بنتِ حوا کی ہر پُرخلوص پیش کش ٹھکرا کر اپنی حسِ مردانگی کو تسکین دینے کی فکر میں رہتا ہے۔ایسے ابنِ آدم اپنی حوازادیوں سے اکثر شرعی وغیر شرعی عدالتوں کے کٹہروں میں آمنا سامنا کرتے ہیں۔صدیوں سے ابنِ آدم یہ سمجھتا آرہا ہے کہ طلاق کی تلوار اُس کی میان میں رکھی رہتی ہے، وہ جب جی چاہے، بنتِ حوا کے تین ٹکڑے کر سکتا ہے۔مگر اب بنتِ حوا، ابنِ آدم کے اس وار سے پہلے ہی اسے نہتا کرنے کے ہنر سیکھنے میں پُرجوش نظر آرہی ہے۔شرعی اور فقہی میدان میں مرد کی اجارہ داری نے اسے بلاشرکتِ غیرے مغرور بنا رکھا تھا۔اب بنتِ حوا اس میدان میں بھی اس کی اجارہ داری توڑنے میں سرگرمِ عمل ہے۔

ایک مداح

(برطانیہ)

ہدیۂ سپاس

رضیہ اسماعیل ہیں مہماں ہماری دیکھنا
آئی برمنگھم سے ہے ان کی سواری دیکھنا

یہ جو موتی ٹانکتی ہیں گفتگو کے درمیاں
رقص کرنے لگتی ہے دل کی زمیں پر کہکشاں

فاصلوں کی حد میں رہتی ہیں صباحت کی طرح
جانتی ہیں کیسے پڑتی ہے محبت کی طرح

آگہی تقسیم کی ہے صورتِ بادِ صبا
سانس کی لہروں پہ جیسے روشنی کا آئینا

گفتگو کرتی ہیں یہ لہجے میں مصری گھول کر
مطمئن ہوتا ہے قلب و ذہن ان سے بول کر

یہ سمجھتی ہیں رفیقِ زندگی کو زندگی
ظلم کو کہتی ہیں ظلمت، روشنی کو روشنی

ان کی حق گوئی پہ نازاں کیوں نہ ہوں اہلِ سخن
جگمگاتی ہیں وطن کا نام بیرونِ وطن

رضیہ اسماعیل سے ملنا ہوا مدت کے بعد
سیج پر آنکھوں کی اترا یہ دیا مدت کے بعد

اس دیئے کی روشنی سے راستہ ملتا رہے
کوئی بھی موسم ہو راہی یہ چمن کھلتا رہے

اقبال راہی
کوینز روڈ فائر بریگیڈ لاہور
۲۲؍اگست ۲۰۰۱ء

تعارف
اور
تخلیقی سفر

تعارف

خاندانی نام: رضیہ خالدہ سلطانہ

قلمی نام: رضیہ اسماعیل

پیدائش: ۹ رجون (۱۵ رر رمضان المبارک)

بھروکی چیمہ (پاکستان)

برج: جوزا

اولاد: دو بیٹیاں

ثناء عائشہ اسماعیل

ڈاکٹر وردہ اسماعیل

شریکِ سفر: محمد اسماعیل اعظم

پہلی شعری کاوش: ۱۹۷۱ء سنٹرل گورنمنٹ گرلز کالج اسلام آباد

کے انٹر کالجیٹ مشاعرے میں طرحی مصرع پر غزل لکھی

جو بعد میں کالج میگزین میں شائع ہوئی۔

؎ آگئے پھر میری زنجیر ہلانے والے

پہلی نثری کاوش: ۱۹۷۳ء میں گورنمنٹ گرلز کالج گجرات میں

افسانہ نویسی کے مقابلے میں انعام حاصل کیا

برطانیہ آمد: ۳۱ر دسمبر ۱۹۷۳ء

تعلیم وتربیت: بی اے (آنرز) پنجاب یونیورسٹی لاہور
ایم اے انگلش کراچی یونیورسٹی
پبلک ایڈمنسٹریشن ڈپلومہ
آکسفورڈ یونیورسٹی
مانٹیسوری (Montessori) ٹیچنگ ڈپلومہ لندن
سوشل ورک ڈپلومہ برمنگھم
ایم اے سوشل ورک۔۔وارک یونیورسٹی
ڈاکٹریٹ: لندن یونیورسٹی۔موضوع مقالہ
''خانگی تشدد کے بچوں پر اثرات''
(ہر امتحان امتیازی نمبروں اور اسکالرشپ کے ساتھ پاس کیا)

پیشہ وارانہ خدمات: برٹش سول سروس
بی سی سی آئی بنک
ایوننگ میل نیوز پیپر
ایجوکیشن ویلفیئر سروس
سوشل سروسز
کمیونٹی والنٹری سروس ایڈوائزر

فلاحی اداروں سے وابستگی: پاکستانی خواتین کی ادبی اور ثقافتی تنظیم ''آگہی'' کی بانی اور تاحیات صدر (تنظیم کی بنیاد ۱۹۹۷ء میں رکھی گئی)
ریڈیو ایکس ایل -نیوز ریڈر
ریڈیو شائین-براڈ کاسٹر

	ویمن ایڈ (Women Aid)
	بلیک ویمن فورم (Black Women Forum)
	سمال ہیتھ کمیونٹی فورم
	اقبال اکیڈمی
	نیشنل اکیڈمی آف برٹش رائٹرز
	سردار میموریل ویلفیئر ٹرسٹ
	برطانیہ میں بہترین کمیونٹی خدمات پر
	ملینئیم کمشن کی تاحیات فیلوشپ
مشاغل اور	کتب بینی، قلم کی ناز برداریاں،
دل چسپیاں:	مطالعہ فطرت، خودکلامیاں، سیر وسیاحت
	فلم بینی اور خدمتِ خلق
پسندیدہ عالمی	ہیلن کیلر، ذوالفقار علی بھٹو، میلکم ایکس
شخصیات:	شہزادی ڈایانا، نیلسن منڈیلا، عبدالستار
	ایدھی اور عمران خان
تخلیقی جہات:	غزل، نظم (پابند، آزاد، نثری)، ماہیے
	دوہے، افسانہ، کہانی، مختصر ڈراما، کالم
	رپورتاژ، انشاپردازی، طنزومزاح اور سفرنامہ

ادبی اور تخلیقی سفر

شاعری

- گلابوں کو تم اپنے پاس رکھو (غزلیں، نظمیں)......۲۰۰۰ء
- سب آنکھیں میری آنکھیں ہیں (نظمیں)......۲۰۰۱ء
- میں عورت ہوں (نثری نظمیں+انگریزی ترجمہ)......جون ۲۰۰۰ء
- پیپل کی چھاؤں میں (رنگ رنگ کے ماہیے)......۲۰۰۱ء
- ہوا کے سنگ سنگ (غزلیں، نظمیں دوہے)......۲۰۱۱ء
- خوشبو، گلاب، کانٹے (پانچوں مجموعوں کی کلیات)......۲۰۱۲ء
- تتلیاں اُداس ہیں......شاعری/مصوری (زیرِ طبع)

نثر

- چاند میں چڑیلیں (طنز و مزاح)......۲۰۰۰ء
- کہانی بول پڑتی ہے (پوپ کہانیاں)......۲۰۱۲ء
- کاغذی ہے پیرہن (افسانے، زیرِ تصنیف)
- ہم روحِ سفر ہیں (ایک منفرد سفرنامہ، زیرِ تحقیق و ترتیب)

تالیفات

- نذرانۂ عقدت......مجموعۂ درودشریف......۱۹۹۷ء
- نیشنل ویمن ڈائریکٹری ۱۹۹۹ء

(برطانیہ میں قلم کار خواتین کی حوالہ جاتی دستاویز)...... بہ اہتمام ''آ گہی''

- رائٹ ٹریک(Write Track)......۲۰۰۰ء

(''آ گہی'' کے زیرِ اہتمام برطانیہ میں ینگ ایشین ویمن رائٹرز کی نثری اور شعری تخلیقات کا خاص نمبر، اردو اور انگریزی میں)

- پوئٹری ٹائم (Poetry Time)......۲۰۰۰ء

(''آ گہی'' کے زیرِ اہتمام برطانیہ میں ینگ ایشین رائٹرز کا شاعری کا مقابلہ اور انعامات حاصل کرنے والی تخلیقات کتابی شکل میں شائع کی گئیں)

- قرضِ وفا (شہناز مزمل کی شاعری کا انتخاب)......۲۰۰۲ء

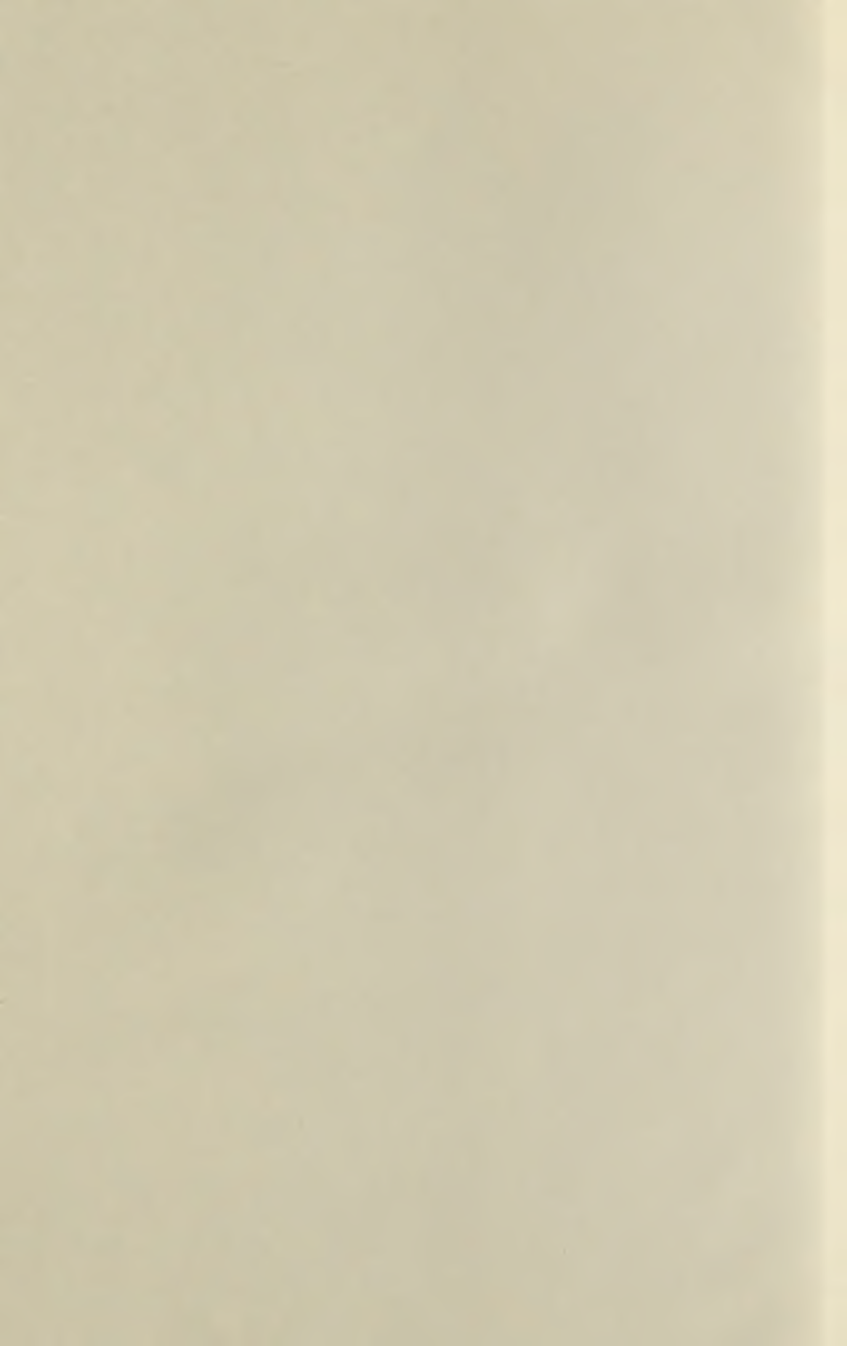
''آ گہی'' ویب سائٹ کا اجراء ۱۹۹۹ء

www.aaghee.co.uk

رابطہ: ای میل

aaghee@hotmail.com





میں خار خار الجھتی رہی تمھارے لئے
میں پھول پھول مہکتی رہی تمھارے لئے

وصال رُت میں گلابوں کا ہاتھ تھامے ہوئے
میں چہرہ چہرہ دمکتی رہی تمھارے لئے

Design By Muhammad Ahsun



بک سٹریٹ 46-مزنگ روڈ لاہور، پاکستان فون : 37245072 - 042-37231518 فیکس: 042-37310854

E-mail: bookhome1@hotmail.com - bookhome_1@yahoo.com
www. bookhomepublishers.com